نئے غلام

کرشن چندر

نئے غلام

کرشن چندر

مکتبہ اردو ادب
بازار ستھاں اندرون
لوہاری گیٹ لاہور

ناشر ——— سرفراز احمد
مطبع ——— منظور پریس لاہور

قیمت ——— -/۱۲ روپے

فہرست

	صفحہ نمبر
کرشن چندر	۷
نئے غلام	۲۳
پہلا اور تیسرا	۴۰
سڑک کے کنارے	۵۲
اخباری ہوتشی	۶۵
صاحب	۷۴
مورتیاں	۸۴
سیٹھ جی	۹۴
کشمیر کو سلام	۱۰۲
مہالکشمی کا پل	۱۱۱
مچھلی جال	۱۲۴
کشمیر کچہر	۱۴۶
گیت اور کچہر	۱۵۹

ے ساتھ لذا ر
ے سلسلے کی طرح۔
ایسی باتیں بتا سکوں

مہندر ناتھ

کرشن چندر

کرشن چندر کی دو شخصیتیں ہیں۔ ایک اُن کی ادبی شخصیت، جس سے آپ لوگ اچھی طرح واقف ہیں، ۷۰ کتابوں کا مصنف جو ہند اور پاک کی جنتا کا سب سے محبوب فن کار ہے اور جس کی شہرت اپنے دیس سے باہر بھی اردو افسانے کو چار چاند لگا رہی ہے۔ کرشن چندر روس میں بے حد مقبول ہیں، اُن کے افسانوں کی ایک کتاب تقریباً ڈیڑھ لاکھ فروخت ہو چکی ہے۔ اور روس کے علاوہ چین، چیک، ایسٹ جرمنی اور روس کی باقی سترہ زبانوں میں ان کے افسانوں اور ناولوں کا ترجمہ ہو چکا ہے۔ میں آج کرشن چندر کی ادبی شخصیت اور اُن کے فن کے بارے میں کچھ نہیں لکھوں گا کیونکہ اس موضوع پر ایک پوری کتاب چاہیے، محض ایک مضمون کافی نہ ہو گا۔

لیکن ایک کرشن چندر اور بھی ہیں جن کی کتابیں آپ پڑھتے ہیں، لیکن جن کے متعلق آپ بہت کم جانتے ہیں۔ میں یہ مضمون اس لیے لکھ رہا ہوں کہ میں اُن کے بارے میں بہت کچھ جانتا ہوں۔ تقریباً زندگی کے ۳۵ سال میں نے اُن کے ساتھ گذار دیے ہیں۔ جہاں بھی وہ گئے میں ان کے ساتھ رہا بالکل ایک سائے کی طرح۔ اس لیے آپ کے محبوب فن کار کے متعلق بہت سی ایسی باتیں بتا سکوں

گا، جو شاید آپ کو معلوم نہ ہوں، کرشن چندر کی پیدائش ریاست بھرت پور میں ہوئی۔ اس ریاست میں ہمارے والد بحیثیت ڈاکٹر نوکر تھے، کرشن چندر کی عمر پانچ برس کی تھی، جب ہمارے والد صاحب نے ریاست پونچھ میں ملازمت اختیار کر لی، کرشن چندر کا بچپن وہیں گزرا، دسویں جماعت تک پونچھ کے ہائی سکول میں تعلیم پائی، سکول کے زمانے میں ان کی ذہانت کا چرچا ان کے دوستوں کی زبانی سنا کرتا تھا، ریاضی میں کمزور لیکن ہسٹری اور Geography میں سب سے آگے اور اول، کرشن چندر کو کھیل کود میں کافی شغف تھا، خاص کر کرکٹ کھیلنا بے حد پسند کرتے تھے،

ان کے دوستوں کی تعداد سب سے زیادہ تھی، وہ بے حد ملنسار تھے، کھیل کود کے علاوہ انہیں ڈراموں میں کام کرنے کا بہت شوق تھا ایک بار تو انہوں نے مہابھارت کے ڈرامے میں ارجن کا پارٹ ادا کیا اور کافی خوبصورتی سے ادا کیا۔ ۔ ۔ اس زمانے میں سنگیت اور Painting سے بھی دلچسپی رہی، ساتویں جماعت اور آٹھویں جماعت میں انہوں نے دس پندرہ تصویریں بنائیں لیکن نویں اور دسویں جماعت میں انہیں ڈرامے سے دلچسپی ہو گئی،

پونچھ میں ان دنوں کوئی سینما گھر نہ تھا، کبھی کبھار لیلا رچائی جاتی تھی، یا باہر سے گوییے آتے تھے، یا ماسٹر رحمت کی ڈرامہ کمپنی مختلف ڈرامے کھیلا کرتی تھی، کرشن چندر نے شاید ہی کوئی ڈرامہ نہ دیکھا ہو، اکثر وہ بہانہ بنا کر چلے جاتے کہ فلاں کے گھر پڑھنے جا رہا ہوں، لیکن جاتے تھے وہ ڈرامہ دیکھنے، ہماری والدہ اکثر ان پر خفا ہوتی تھیں، لیکن والد کچھ نہ کہتے تھے،۔ ۔ ۔ ۲۵ سال سے میں نے اپنے والد کو کبھی بچوں پر خفا ہوتے ہوئے نہیں دیکھا، وہ نہایت ہی خاموش اور سنجیدہ

قسم کے آدمی تھے، اور یہ خاموشی اور سنجیدگی شاید ہم نے ورثے میں پائی ہے۔

سکول کے زمانے میں ہی کرشن چندر کو کتابوں کے پڑھنے کا شوق پیدا ہوا، سب سے پہلے الف لیلیٰ پڑھی، پھر فسانہ آزاد، پھر پریم چند کی کہانیاں، ٹیگور کے ناول انہوں نے دسویں جماعت سے پہلے ہی پڑھ ڈالے۔

جب وہ پڑھتے تھے، تو کھانا، پینا اور کسی سے بات کرنا بھول جاتے تھے، والدہ اگر بلاتیں تو وہ جواب تک نہ دیتے، والدہ باورچی خانے سے غصے سے بھری ہوئی نکلتیں، کتاب ہاتھ سے چھین کر پھینک دیتیں اور کھانے کے لیے کہتیں بہر حال کرشن چندر کو والدہ کا کہنا ماننا پڑتا اور کھانا کھا لیتے، کتنی بار والدہ نے والد صاحب سے شکایت کی کہ انہیں کتابیں نہ پڑھنے دیا کریں، صحت خراب ہو جائے گی، آنکھیں کمزور ہو جاتی ہیں، اور آدمی کسی کام کا نہیں رہتا لیکن والدِ محترم کچھ نہ کہتے، بس ایک چپ، ایک لمبی خاموشی! اور والدہ بڑبڑاتی خاموش ہو جاتی،

کرشن چندر کا پہلا مضمون مزاحیہ تھا، جو انہوں نے میٹرک کے زمانے میں اپنے فارسی کے ٹیچر پر لکھا تھا، جو ہفتہ وار پرچہ "ریاست" میں چھپا، یہ ان کی پہلی کوشش تھی جو ان کے دوستوں نے کافی پسند کی، کالج کے زمانے میں وہ زیادہ تر انگریزی میں لکھتے رہے اور اپنے کالج کے میگزین سیکشن کے ایڈیٹر رہے، کالج کے زمانے میں انہوں نے کھیل کود میں حصہ لینا چھوڑ دیا اور کالج سے باہر کی دنیا میں زیادہ دلچسپی لی، جب کرشن چندر ایف، ایس، سی میڈیکل میں پڑھتے تھے، ان دنوں وہ گورودت بھون میں رہتے تھے، یہیں پر بھگت سنگھ کے ساتھیوں سے ان کا تعارف ہوا اور جب بھگت سنگھ اور اس کا گروہ پکڑا گیا

تو کرشن چندر کو بھی پولیس پکڑ کر لے گئی اور کرشن چندر تقریباً ایک ماہ تک لاہور کے
قلعے میں نظر بند رہے۔ تفتیش کے بعد کرشن چندر کو رہا کر دیا گیا۔ شاید انہی دنوں
ان کا سیاسی نظریہ بننے لگا تھا کیونکہ انہوں نے کالج کی زندگی کو زیادہ اہمیت
نہ دی۔ ڈگری حاصل کرنا تو ٹھیک بات تھی لیکن زندگی کا مقصد محض ڈگری حاصل
کرنا نہیں تھا۔ وہ کالج کے کورسوں کو بہت کم پڑھتے تھے۔ زیادہ وقت ناولوں
اور کتابوں کے پڑھنے میں صرف ہوتا تھا۔ طلبا کی تحریک میں حصہ لینا شروع
کر دیا تھا۔ کرشن چندر نے فارمین کرسچین کالج سے انگلش کا ایم۔ اے کیا پھر
ایل ایل بی کی ڈگری لی۔ ان چار سالوں میں کرشن چندر نے مختلف شعبوں میں کام
کیا۔ سیاست میں ان کی دلچسپی بڑھنے لگی۔ ایل۔ ایل۔ بی کے دنوں میں سوشلسٹ
پارٹی کے نزدیک ہوتے گئے۔ یہاں تک کہ ایک بار کرشن بھنگیوں کی پہلی
انجمن کے صدر چنے گئے۔ انہی دنوں کرشن چندر نے کہانیاں لکھنی شروع کیں
"یرقان"، "انگور" اور "طلسم خیال" کا مجموعہ انہی دنوں چھپا۔ طنزیہ اور مزاحیہ
انداز میں مضمون لکھے پھر "دو فرلانگ لمبی سڑک" ایسی معرکۃ آلارا کہانی لکھی
جس نے اردو افسانے میں ایک انقلاب برپا کر دیا۔ لیکن اس عرصے میں
کرشن چندر سیاست کی گتھیوں کو بھی سلجھاتے رہے۔ وہ تقریباً ہر روز بھنگیوں
کی چالوں میں جاتے تھے، لیکچر دیتے تھے، میٹنگ آرگنائز کرتے تھے، پنجاب
کے لیڈروں سے بات چیت کرتے تھے۔ جب تک وہ یہ طے نہ کر پائے
تھے کہ انہیں کیا بننا ہے۔ کیا انہیں پروفیسر بننا چاہیے۔ یا ایک سیاست
داں۔ چالوں کے گرد چکر لگاتے ہوئے لیڈروں سے ملتے ہوئے کہانیاں

لکھتے ہوئے انہیں یہ طے کرنا تھا کہ کالج کی زندگی کے بعد انہیں کیا کرنا تھا، ان دنوں وہ ہند ہوٹل میں رہتے تھے، یہاں پر کنہیا لال کپور، اشک اور بیدی سے ملاقات ہوئی، ادیبوں نے آنا شروع کیا، ہمایوں نے کرشن چندر کے مضمونوں کی بہت تعریف کی، ہندوستان کے مختلف رسالوں سے افسانوں کی مانگیں بڑھنے لگیں، ادبی دنیا کے ایڈیٹر صلاح الدین احمد نے ان کے افسانوں کا جائزہ لیتے ہوئے ان کی ہمت افزائی کی، کرشن چندر کی زندگی کا یہ دور الجھنوں سے بھرپور تھا، دماغ میں کشمکش تھی، کیا انہیں سیاست داں بننا چاہیے یا محض ایک ادیب اور آخر کار انہوں نے فیصلہ کیا کہ وہ اپنی ساری زندگی ادب کی نذر کر دیں گے، یہ فیصلہ ایک نیک فال تھا، کیونکہ ان کی طبیعت کا رجحان بھی یہی تھا محض لیڈری ان کے بس کی بات نہ تھی۔

اور جب کرشن چندر یہ فیصلہ کر چکے تو انہوں نے متواتر افسانے لکھنے شروع کر دیے، ایک افسانہ کے بعد دوسرا افسانہ پھر تیسرا، ایک کتاب کے بعد دوسری کتاب پھر تیسری کتاب، اور پھر ایک دن آیا کہ وہ ہندوستان کے سب سے بڑے افسانہ نگار بن گئے، اس میں شک نہیں کہ انہوں نے بے حد محنت کی وہ کبھی بھی آرام نہ کرتے تھے، وقت کو یوں ضائع نہ کرتے تھے، کتابیں پڑھنا یا لکھنا ان کا محبوب مشغلہ بن گیا اور ان کی شہرت ملک کے کونے کونے میں پھیل گئی، جب کرشن چندر محض ایک ذہین طالب علم تھے، میں ان کے ساتھ تھا، جب انہوں نے لیڈر بننے کی کوشش کی، میں ان کے ساتھ تھا، جب وہ ایک مشہور افسانہ نگار بن گئے میں ان کے ساتھ تھا، لیکن میں

نے ان کے رویے میں کوئی فرق نہ دیکھا، ان تمام باتوں میں ان کے معاملات میں کوئی فرق نہ آیا، وہی ہنستا ہوا چہرہ، زبان میں وہی حلاوت اور مٹھاس چہرے پر وہی شگفتگی اور زندگی سے اتنا ہی پیار، لوگوں پر بھی اتنا ہی بھروسہ اور اتنا ہی اعتماد۔

پڑھنے والے انہیں کتنا چاہتے ہیں۔ ان سے کتنا پیار کرتے ہیں۔ پڑھنے والوں کے دلوں میں کرشن چندر کی کتنی قدر و منزلت ہے، اس کا مجھے احساس نہ تھا شاید انھوں نے اس کا احساس دلانے کی کبھی کوشش نہ کی اور میں انہیں صرف ایک مشفق اور مہربان بھائی سمجھتا رہا۔

لیکن اس عرصہ میں ایک عجیب واقعہ ہوا جس کا ذکر میں یہاں کرنا چاہتا ہوں ۔میں' ڈی اے' وی کالج میں ایم۔ اے کی تعلیم پا رہا تھا اور اپنی کلاس میں کرشن چندر کی نئی کتاب' نظارے' کی ورق گردانی کر رہا تھا کہ ایک طالب علم میرے قریب آیا۔ اس نے یہ کتاب مجھ سے لی۔ کرشن چندر کی تصویر جو اس میں شامل تھی، دیکھ کر کہنے لگا،" آپ انہیں جانتے ہیں۔

"جی ہاں"

"کہاں رہتے ہیں کرشن چندر؟"

"کیا بات ہے؟"

"میں ان سے ملنا چاہتا ہوں۔"

"میں آپ کو ان سے ملا دوں گا۔"

"آپ کیسے ملا دیں گے؟"

"میں انھیں جانتا ہوں"

"کیسے؟"

"میں ان کے ساتھ رہتا ہوں۔"

"کیوں؟"

اس کیوں کا جواب میرے پاس نہ تھا۔ میں ذرا خاموش ہو گیا۔

"آپ انہیں کیسے جانتے ہیں؟"

"میں ان کا بھائی ہوں" یہ ٹھیک بھی تھا۔ ان دنوں میں کرشن چندر کا حقیقی بھائی تھا، افسانہ نگار نہ تھا۔

"آپ واقعی ان کے بھائی ہیں؟" اس نے حیرت سے پوچھا۔ جیسے کرشن چندر کا کوئی بھائی نہیں ہو سکتا۔

"آپ کو یقین نہیں آتا؟" میں نے چڑ کر کہا۔

"آپ ان کے سگے بھائی ہیں؟" اس نے پھر لفظ "سگے" پر زور دیتے ہوئے کہا۔

میں نے کہا: "ہاں"

اس کا چہرہ اتر گیا۔ اس نے شاید یوں کبھی نہ سوچا تھا۔

طالب علم کی یہ کیفیت دیکھ کر مجھے بے حد صدمہ ہوا۔ میں نے دل ہی دل میں اپنے آپ کو کوسا۔ میں نے سوچا، مجھے کرشن چندر کے متعلق اس طالب علم کو کچھ نہ بتانا چاہیے تھا۔ نہ جانے یہ کرشن چندر کو کیا سمجھتا ہے۔ شاید وہ کرشن چندر کو کوئی آفاقی شخصیت سمجھتا تھا۔ شاید وہ یہ سمجھتا تھا کہ کرشن چندر

زمین پر نہیں رہتا۔ آسمان پر رہتا ہے یا کشمیر کے مرغزاروں میں رہتا ہے، شاید کرشن چندر کا کوئی بھائی نہیں ہو سکتا اس کی کوئی ماں باپ۔ اور دیگر۔ رشتہ دار نہیں ہو سکتے۔ شاید کرشن چندر کچھ نہیں کھاتا، وہ صرف افسانے لکھتا ہے، طالب علم یہ سن کر آگے بڑھ گیا۔ اس نے کرشن چندر سے ملنے کے لیے خواہش ظاہر نہ کی۔ اس کے خوابوں کو شدید جھٹکا لگا تھا۔

اس دن سے میں نے یہ قسم کھالی کہ میں اب دوبارہ کسی کے سامنے اپنے آپ کو کرشن چندر کا بھائی نہ کہوں گا۔ کرشن چندر جو عوام میں اتنا محبوب ہے شاید لوگ اسے یوں دیکھنا پسند نہیں کرتے تھے۔ اس واقعے کے بعد میں نے آج تک کسی شخص کو یوں نہ کہا کہ "میں کرشن چندر کا بھائی ہوں"۔

کرشن چندر بے حد نارمل قسم کے انسان ہیں۔ اُن سے مل کر آپ اُن کی ادبی شخصیت کے کبھی قائل نہ ہوں گے، کیونکہ آپ پر کبھی رعب نہ جمائیں گے، وہ آپ کی باتیں سُنیں گے۔ آپ کے نظریے کی جان پہچان کریں گے۔ وہ اپنے افسانوں کے بارے میں آپ کی رائے چاہے وہ اچھی ہو یا بُری ہو بڑی خندہ پیشانی سے سُن کر برداشت کریں گے۔ صبر کا مادہ کرشن چندر میں سب سے زیادہ ہے۔ میں نے آج تک انہیں خفا ہوتے نہیں دیکھا۔ کبھی کبھی تو میں سوچتا ہوں کہ کرشن چندر کے پاس اتنی قوتِ برداشت کہاں سے آئی۔ زندگی میں کتنی بار مشکلات کا سامنا کرنا پڑا لیکن وہ زندگی سے لڑتے رہے حرفِ شکایت ان کے لبوں پر کبھی نہ آیا۔ زندگی میں تلخی جو کبھی زہر کا روپ دھارن کر لیتی ہے، اُن کی گھریلو زندگی میں اس کا اظہار کبھی نہ ہوا۔

یہ ٹھیک ہے کہ انہوں نے زندگی میں ناکامیوں کا منہ بہت کم دیکھا لیکن اپنی شہرت حاصل کرنے کے بعد ساتھی توازن کبھی نہ کھویا، ہر چھوٹے اور بڑے ادیب کی عزت کی، اپنی بساط کے مطابق ہر ادیب کی ہمت افزائی کی اسے آگے بڑھنے کی تلقین کی، اُسے مشورہ دیا، اُسے اچھی صلاح دی، ادیبوں سے مدد کی، میں نے آج تک کرشن چندر کی زبان سے کسی ادیب کے خلاف کچھ نہیں سنا حسد کا جذبہ ان میں نہیں ہے وہ زندگی میں صرف خود ہی آگے بڑھنا نہیں چاہتے بلکہ ادیبوں کے قافلے کو اپنے ساتھ لے کر آگے بڑھنا چاہتے ہیں۔

جب کرشن چندر آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن پر نوکر ہوئے تو اس نوکری کو پا کر انہیں خوشی نہ ہوئی، اور اس بات کا ذکر انہوں نے ایک کتاب کے انتساب میں کیا جس میں یہ لکھا "اس کرشن چندر کے نام جس نے ایک حسین صبح کو اپنا گلا گھونٹ لیا"۔ یہ وہ صبح تھی جب انہوں نے آل انڈیا ریڈیو پر نوکری کرنی منظور کر لی تھی۔

دراصل وہ یہ چاہتے تھے کہ محض لکھ کر اپنا اور باقی کنبے کا پیٹ پال سکیں، لیکن ہندوستان میں ایک ادیب کے لیے ناممکن ہے کہ وہ صرف کتابوں کی آمدنی پر ایک صحت مند زندگی گذارے۔

انہیں اپنی شخصی آزادی کے کھونے کا رنج تھا شاید وہ سمجھتے تھے کہ سرکار کی نوکری کرنے کے بعد وہ آزادی سے لکھ نہ سکیں گے۔ لیکن آل انڈیا ریڈیو کی نوکری کرتے ہوئے بھی انہوں نے ترقی پسند افسانے اور ڈرامے لکھے سرائے کے باہر اسی نوکری کے دوران میں لکھا گیا۔ دہلی ریڈیو اسٹیشن پر ادیبوں کا جمگھٹا لگا رہتا تھا۔ یہیں پر میری پہلی بار منٹو، راشد، میراجی، احمد ندیم قاسمی، اوپندر ناتھ

اشک، شمشیر سنگھ نرولا، شاہد احمد دہلوی، چراغ حسن حسرت، ڈاکٹر تاثیر اور دیگر احباب سے ملاقات ہوئی۔

کرشن چندر کا گھر ان دنوں ادیبوں کا مسکن بنا ہوا تھا۔ تقریباً ہر ادیب سے ملاقات ہو جاتی۔ اگر گھر پر نہیں تو ریڈیو اسٹیشن پر۔ ان دنوں اپندر ناتھ اشک اور منٹو کی خوب لگتی تھی، لیکن کوئی حاسدانہ جذبہ نہ تھا۔ ان دنوں آل انڈیا ریڈیو اسٹیشن دلی سے بہترین ڈرامے نشر کیے گئے۔ کرشن چندر ڈرامہ سیکشن کے انچارج تھے اگر اشک ایک ڈرامہ لکھ کر لاتے تو منٹو دو ڈرامے لکھ کر لاتے۔ ان دنوں خوب بحثیں ہوا کرتی تھیں ادیب آپس میں مل بیٹھ کر خوش ہوتے تھے۔ تخلیقی کام میں ایک دوسرے کی مدد کرتے تھے۔ ایک دوسرے سے پیار کرتے تھے۔

ایک دوسرے کو گھر پر بلاتے تھے، اکٹھے ملتے تھے، کھاتے پیتے تھے، ہنستے تھے اور لکھتے تھے، اور بے حد خوبصورت چیزوں کی تخلیق کرتے تھے۔ ان دنوں تمام ادیبوں میں بھائی چارے کا شدید احساس تھا۔

میں نے اس قسم کا ادبی دور کبھی نہیں دیکھا۔ ادیبوں کو اس طرح خوش رہتے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔ ان دنوں اردو افسانہ سن بلوغ کو پہنچ چکا تھا۔ ہر ادیب ایک دوسرے سے اچھا لکھنے کی کوشش کرتا تھا، اور ہر اچھے افسانے کی تعریف کرتا۔۔۔ چاہے وہ اپنا ہو یا کسی اور کا۔ انہی دنوں کرشن چندر کے گھر میں نئے ادیبوں نے آنا شروع کیا۔ عسکری آتے تھے، نہایت خاموش اور متین اور سنجیدہ ہاں یا نہ کر کے واپس چلے جاتے۔

کرشن چندر دلی سے لکھنؤ گئے اور اس کے بعد ڈبلیو زیڈ احمد نے انہیں

شالیمار میں بلا لیا۔ سرکاری ملازمت ترک کرنے کے بعد انہیں ذہنی تسکین مزید ملی۔ ریڈیو پر کافی کام کرنا پڑتا تھا۔ لیکن ریڈیو پر کرشن چندر کو ہر قسم کی سہولتیں میسر تھیں۔ اعلیٰ افسران کی عزت کرتے تھے۔ بخاری، کرم ناتھ چب اور دیگر افسروں نے کرشن چندر کے تخلیقی کام میں کبھی رکاوٹ نہ ڈالی۔

پونہ میں آنے کے بعد انہوں نے اس بات کا پورا تہیہ کر لیا تھا کہ فلم ان کی ادبی زندگی میں رکاوٹ نہ بن سکے۔ اور پونہ میں رہ کر انہوں نے بہترین افسانے لکھے۔ یہ نہیں کہ وہ فلم کی طرف توجہ نہ دیتے تھے بلکہ وہ ادبی کاموں کو سب سے افضل درجہ دیتے تھے۔ ادبی تخلیق میں وہ compromise کے قائل نہیں کبھی کبھی میں ان کے اس رویہ پر حیران اور ششدر رہ جاتا ہوں کہ کرشن چندر ایسا ارمل انسان جو زندگی میں ہر قسم کی بات برداشت کر لیتا ہے وہ ادب میں کوئی ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ compromise کرنے کے لیے تیار نہیں۔ وہ فلمی کہانی میں دلچسپی قائم رکھنے کے لیے پروڈیوسر کی بات مان لیں گے لیکن ادب میں وہ جس بات کو صحیح سمجھیں گے، اسی پر عمل کریں گے۔

ادب میں ان کی شخصیت کا روپ نہایت مکمل، صحیح اور جاذب نظر ہے، وہ تمام باتیں جو کرشن چندر اپنی زندگی میں کرتے تھے، ادب میں ان کا بہترین انتخاب آتا ہے، زندگی کا صحیح نچوڑ، اگر کسی ادیب نے صحیح معنوں میں ادب کو ایک لڑنے کا ہتھیار بنایا ہے تو اس کا جائز استعمال کرشن چندر نے کیا ہے انہوں نے اردو افسانے کو تلوار کی صورت دے دی ہے۔

کرشن چندر کی زندگی مختلف ادوار سے گذری ہے۔ اچھے دن بہت دیکھے ہیں، روپیہ کافی کمایا جو انہوں نے خرچ کر دیا برے دن بھی دیکھے لیکن

اُنہوں نے ہمت کبھی نہیں ہاری، یاسیت اُن کے نزدیک بھٹک نہیں پائی، دونا انہوں نے سیکھا نہیں، یار دوستوں کے رحم و کرم پر جینا بھی نہیں سیکھا، چاپلوسی کے وہ قائل نہیں، زیادہ تعریف بھی وہ پسند نہیں کرتے، دوستوں اور ادیبوں کے سامنے اپنے افسانوں کا ذکر نہیں کریں گے، دوسرے ادیبوں کے اچھے افسانوں کی وہ تعریف کریں گے۔

کرشن چندر روپیہ کمانا جانتے ہیں، لیکن ان کی نگاہ میں روپیہ اس لیے کمایا جاتا ہے کہ اسے خرچ کیا جائے، اگر کوئی ضرورت مند اُن کے پاس آتا تو وہ ضرور اس کی مدد کرتے، روپیہ بچانا وہ نہیں جانتے، جیب میں روپے رہ نہیں سکتے انہیں خرچ کرنا ان کا اہم فریضہ ہے اور روپیہ کمانا اس سے بھی بڑا کام،

اکثر وہ بیمار بھی ہو جاتے ہیں اور بیماری کے دنوں میں زیادہ پڑھتے اور لکھتے ہیں اور ساتھ ہی تھوکتے ہیں، ان کے تھوکنے کی عادت سے ہر شخص تنگ ہے، وہ ہر جگہ تھوکتے ہیں۔ گھر کے اندر، گھر کے باہر صحن میں، پھاٹک میں، ڈرائینگ روم میں، کھانے سے پہلے، کھانے کے بعد، اور پھر تھوکنے کے بعد مسکرا دیں گے، اور ساتھ ہی کہیں گے "بھیّا ایک سگرٹ دینا"

سگرٹ وہ خرید کر نہیں پیتے۔ اکثر دوست اُن کی حرکتوں سے چڑ جاتے ہیں لیکن آخر میں اُن کی یہ حرکتیں برداشت کرنی پڑتی ہیں، کیونکہ وہ خود بھی دوستوں کی بہت سی عجیب حرکتوں کو برداشت کر لیتے ہیں،

کرشن چندر کو اچھے لذیذ کھانوں کا شوق ہے۔ وہ کالج میں سوٹ اور ٹائی کے بغیر نہ جاتے تھے، شروع میں کچھ [illegible] پہننے کا شوق تھا لیکن

لے کرنے کے بعد اُن کا Damdm — ختم ہو گیا۔ لیکن اچھی خوراک کھانے کا شوق ابھی تک باقی ہے۔ کار سے پیدل چلنا انہیں زیادہ پسند ہے۔ گھر میں تنہا وہ بیٹھ نہیں سکتے۔ لوگوں سے ملنا انہیں زیادہ مرغوب ہے۔

اور لکھنے کے بارے میں میں بھول گیا۔ لکھتے وقت وہ سب سے بڑھیا کاغذ استعمال کریں گے۔ جتنا زیادہ قیمتی کاغذ وہ خرید سکتے ہیں، خرید کر لائیں گے۔ قلم گھٹیا ہوگا۔ فونٹین پن کا وہ استعمال نہیں کرتے محض ایک عامیانہ قسم کا ہولڈر وہ استعمال کریں گے۔ بازار سے ایک درجن نب خرید لاتے ہیں۔ اور انہیں وقتاً فوقتاً استعمال کرتے رہتے ہیں۔

وہ افسانہ صرف ایک بار لکھتے ہیں۔ دوبارہ اسے شاید پڑھتے بھی نہیں۔ کبھی کبھار اپنا لکھا پڑھ نہیں پاتے۔ کاتب پڑھ لیتا ہے۔ ناول "شکست" انہوں نے ۲۲ دنوں میں لکھا۔ کبھی کبھار لکھنے کی خواہش زیادہ بھڑک اٹھے تو ایک ہفتے میں سات افسانے لکھ دیں گے۔ "اَن داتا"، "مولی"، "کالو بھنگی" اور "بھوبی وان" یہ سب افسانے انہوں نے صرف ایک بار لکھے ہیں اور صرف ایک sitting میں۔ وہ شاید دوبارہ لکھنے کے قائل نہیں۔ پہلے سوچ لیتے ہیں، پھر لکھتے ہیں۔

کرشن چندر جیل جانے سے ڈرتے نہیں۔ تلنگانہ کی تحریک کے دنوں میں جب ہمارے بہت سے ترقی پسند ادیب گرفتار ہو چکے تھے، انہوں نے اس وقت اپنے آپ کو کبھی پیچھے نہ رکھا۔ ترقی پسند انجمن کی میٹنگوں میں باقاعدہ آتے رہے افسانے پڑھتے اور اپنے افسانوں پر تنقید سنتے تھے۔ پھر انہی دنوں South کا دورہ کیا اور واپس آ کر صبح ہوتی ہے ایک رپورتاژ لکھا۔

کرشن چندر کے کردار میں ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ دوسروں پر چھا جانے

کی کبھی کوشش نہیں کرتے ۔میٹنگ میں آکر سب سے پیچھے بیٹھ جائیں گے ۔ اور جان بوجھ کر تقریر نہیں کریں گے ، کوئی بلائے گا تو ضرور اپنی رائے کا اظہار کریں گے ۔ وہ ایک نہایت ہی نارمل زندگی بسر کرتے ہیں ۔ ایک عام انسان ایسی زندگی جیسے اپنے گھر سے محبت ہے ۔ بیوی سے محبت ہے ۔ بھائیوں سے پیار ہے وہ دوستوں میں مل بیٹھ کر خوش ہوتے ہیں ۔ زندگی کی جتنی اچھائیاں ہیں ، انہیں اپنانے کی کوشش کرتے ہیں ، وہ زندگی میں بے راہ روی اختیار کرنے کے قائل نہیں ، بہت سے ادیبوں کی طرح لمبے بال نہیں رکھتے ، گندے اور میلے کپڑے پہننے کے عادی نہیں ،

تھوڑی بہت شراب پی لیتے ہیں ۔ شراب پی کر بہکتے نہیں ۔ بلکہ زیادہ سنجیدہ ہو جاتے ہیں ۔

آج کل وہ بمبئی کے مضافات ورسوا میں قیام پذیر ہیں ۔ ایک نہایت ہی شاندار کوٹھی ، باہر سے شاندار لیکن اندر سے نہایت عامیانہ جس کے اندر ایک عام آدمی رہتا ہے جس کے خیال اونچے ہیں جس کا ادب قد آور ہے جس کی ادبی شخصیت اس کی ذاتی شخصیت سے بہت بلند تر ہے ۔ اس کے رکھ رکھاؤ سے اس کے رہنے سہنے میں ، اس کی بات چیت میں کوئی اوچھے والی بات نہیں اور نہ ہی وہ جان بوجھ کر کوئی ایسی بات کرتا ہے کہ دیکھنے والا اس کی طرف آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے رہ جائے گا ، وہ چپکے سے مسکراتے ہوئے عین سامنے سے گذر جاتے ہیں ۔ اتنی شہرت حاصل کرنے کے بعد ان کی ذات میں گھمنڈ کا شائبہ تک نہیں ۔ مجھ سے اکثر کہتے رہتے ہیں " مجھے لوگوں نے بہت کچھ دیا ۔ مجھے شہرت دی ۔

میرے ادب کے وہ پرستار ہیں، اور مجھے روپے بھی کم نہیں دیے مہندر"۔

جتنے روپے کرشن چندر نے اپنی کتابوں سے کمائے ہیں، شاید ہی کسی ہندوستانی ادیب نے ادب کے ذریعے کمائے ہوں، لیکن جمع کرنے کی اُن کی عادت نہیں۔ جب کبھی وہ عوام کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی آنکھیں چمکنے لگتی ہیں، انہیں عام لوگوں سے بے انتہا محبت ہے، شاید اسی وجہ سے عوام ان سے اتنی محبت کرتے ہیں۔ اور وہ فرطِ محبت سے اپنا سر بلند کر لیتے ہیں کہ میں اکیلا نہیں ہوں، میرے ساتھ میرے عوام ہیں۔ جن کے لیے میں ادب تخلیق کرتا ہوں۔

کرشن چندر کی کامیابی کے دو راز ہیں، پہلی بات یہ کہ وہ کام کرنے سے کبھی نہیں ہچکچاتے۔ اگر وہ لکھیں گے، نہیں تو پڑھیں گے۔ بیکار وقت ضائع نہیں کرتے۔ اگر ان دو چیزوں سے فرصت مل جائے تو باقی وقت سوشل کاموں میں صرف کریں گے۔ کام کرنے کی بے پناہ قوت ان میں ہے بلکہ میں اگر یہ کہوں کہ تخلیقی کام سے انہیں انتہائی محبت ہے تو بے جا نہ ہوگا۔ میں نے زندگی میں انہیں بیکار بیٹھے ہوئے کبھی نہیں دیکھا۔

اور ساتھ ہی انہیں اپنی ذات پر بھروسہ ہے۔ اپنے لوگوں پر بھروسہ ہے اور یہی دو چیزیں ان سے لازوال افسانے لکھواتے کی محرک ہیں، کام کی صلاحیت اور لگن۔ زندگی سے پیار۔ بیکار وقت ضائع نہ کرنا، یہ چیزیں ہم   کو اُن سے سیکھنا چاہئیں۔ یہی ان کی کامیابی کا سب سے بڑا راز ہے۔

ایک بات کے بارے میں میں کچھ نہ کہوں گا۔ وہ ہے اُن کا عشق۔ زندگی میں ہر شخص نے عشق کیا ہے۔ کرشن چندر نے بھی عشق کیے ہیں اور اس موذی

مرض کا تقریباً ہر شخص شکار ہوا ہے، بڑے بڑے ادیبوں نے بڑے بڑے عشق کیے ہیں اور کرشن چندر نے بھی ۔ ۔ ۔ ۔ یہ راہ کچھ ایسی ہے کہ بڑے فن کار بھی بھٹک جاتے ہیں کیونکہ یہ دل کا معاملہ ہے عشق کے کوئی خاص اصول نہیں ہوتے کوئی فارمولا نہیں ہوتا کہ انسان سوچ سمجھ کر چلے ۔

کرشن چندر عشق کرتے ہیں لیکن جلدی راہِ راست پر آجاتے ہیں ۔ ان کا دل بہت بڑا ہے ۔ اور چونکہ انہیں معلوم ہے کہ زندگی میں انہیں کیا کرنا ہے ، اس لیے وہ عشق و محبت کو سب سے افضل چیز قرار نہیں دیتے ۔ اسے ہمیشہ secondary position دی ہے اس مسئلے پر زیادہ روشنی نہیں ڈالوں گا کیونکہ اس میں کسی کا بس نہیں ۔

اخیر میں صرف یہ عرض کروں گا کہ گو کرشن چندر قد آور ادب کی تخلیق کرتے ہیں اور ان کا شمار دنیا کے چوٹی کے ادیبوں میں ہوتا ہے ، لیکن ان کی نجی زندگی ، ایک عام انسان کی طرح ہے ۔

نئے غلام

کوریا کی لڑائی میں مرنے والے امریکی سپاہی کے نام ایک خط

یہ خط میں نے سپاہی کینتھ شیڈرک، عمر بیس سال، ساکن مغربی ورجینیا، امریکہ کے نام لکھا ہے۔ سپاہی کینتھ شیڈرک پہلا امریکی سپاہی ہے جو کوریا کے محاذ پر کوریا والوں کے خلاف لڑتا ہوا مارا گیا۔ اس سپاہی کو امریکہ کے عدد شدہ مین نے وہاں بھیجا۔

میں نے اس کے مرنے کی خبر کل شام کے اخبار فری پریس بلیٹن میں پڑھی تھی، جنرل میک آرتھر کے فوجی ہیڈ کوارٹر نے بڑے طمطراق سے اس کی موت کی خبر شائع کی تھی لیکن اس خبر میں افسوس کا شائبہ تک نہ تھا، مرنے والے کے اعزا سے ہمدردی کا کوئی پہلو نہیں نکلتا تھا مرنے والے کی زندگی اس کی عادتوں اور طور طریقوں پر کوئی روشنی نہیں پڑتی تھی، یہ بھی نہیں پتہ چلتا تھا کہ اس کی شکل و صورت کیسی تھی کیونکہ اس خبر کے ساتھ جو تصویر شائع کی گئی تھی وہ امریکی جنرل میک آرتھر کی تھی، تصویر جنرل میک آرتھر کی تھی، موت سپاہی کینتھ شیڈرک کی۔

جوں ہی میں نے اس کے مرنے کی خبر پڑھی، میں نے اسے خط لکھنے کا فیصلہ کیا۔ یہ تو میں جانتا تھا کہ مُردے میرا خط نہیں پڑھ سکتے۔ لیکن آنی مزد سا امید ہے

کہ اگر کوئی دوسرا سپاہی اس خط کو پڑھے گا تو اُسے پڑھ کر مرنے والے کی ذہنی وردی کے بائیں طرف کی اندرونی جیب میں ڈال دے گا جہاں سپاہی شیڈرک نے اپنی سونے کی گھڑی رکھی ہوتی ہے جہاں اس کی محبوبہ کی ہنستی ہوئی تصویر ہے جہاں اس کی ماں کا آخری خط ہے۔ اور پھر جب جنرل میک آرتھر کے ملازم متوفی کی آخری چیزیں اس سے وارثین کو واپس کریں گے، مجھے امید ہے کہ یہ خط بھی کسی نہ کسی طرح ان چیزوں کے ہمراہ مغربی ورجینیا پہنچ جائے گا، اور وہاں اسے سپاہی شیڈرک کے رشتے دار پڑھیں گے۔ اس کے دوست اور دوسرے ہزاروں نوجوان شیڈرک جن کی عمر ۲۰ سال کی ہے جو مغربی ورجینیا کے رہنے والے ہیں۔ اور جنہیں اس پہلے مرنے والے کی طرح سزائے موت دی گئی ہے۔ اس لیے یہ خط اشد ضروری ہے۔ کیونکہ مردوں کو دوبارہ زندگی نہیں مل سکتی۔ لیکن زندہ تو زندہ رکھے جا سکتے ہیں۔

جس خبر میں شیڈرک کی موت کا ذکر تھا، اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ امریکی فوج کوریا والوں سے پٹ کر بڑی تیزی سے پسپا ہو گئی۔ اتنی تیزی سے کہ وہ لوگ اپنے زخمی اور مردہ سپاہیوں کی لاشیں بھی وہیں چھوڑ گئے، تو اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم ابھی تک وہیں ہو۔

سپاہی شیڈرک تم ابھی تک کوریا کے کسی اونچے ٹیلے پر مرے پڑے ہو۔ اور میں تمہارے دل کے اندر گھسی ہوئی کارتوس کی گولی دیکھ سکتا ہوں تمہاری آنکھوں کا کرب تمہارے سنہرے بال دھوپ میں چمکتے ہوئے اور میرا دل غم اور غصے سے بھر جاتا ہے، اور میں پوچھتا ہوں کہ وہ کون تھا، جو تمہیں یہاں لایا۔

جس نے تم سے تمہاری جوانی، تمہاری محبوبہ، تمہاری ماں کی محبت تم سے چھین لی اور تمہیں وطن سے اتنی دور اجنبی اور انجانے ٹیلے پر مرنے کے لیے مجبور کیا۔ وہ کون تھا جس نے تمہارے ہاتھ میں بندوق دے دی اور تم سے کہا جاؤ اپنی ۲۰ سالہ جوانی کی ساری آرزوؤں اور امنگوں کو اجنبی کوہ پا کے میدانوں اور پہاڑوں پر لے جا کے ان کے سینے میں گولی داغ دو؟ ..... وہ کون تھا؟ ..... وہ کون سی طاقتیں تھیں؟ .... ہمیں ان کا پتہ چلانا ہے، کیونکہ امن کی پیاسی دنیا اس سوال کا جواب چاہتی ہے۔

تم بھی کہو گے عجب انسان ہے، جو اس قدر بے تکلف ہو کر مجھے خط لکھ رہا ہے۔ معاف کرنا میں جلدی میں اپنا تعارف کرانا بھول گیا۔ میرا نام کرشن چندر ہے۔ کچھ عرصے پہلے میں لاہور کی ایک چھوٹی سی گلی میں رہتا تھا۔ میری گلی کا نام پوک متی تھا۔ معلوم نہیں آج کل لوگ اسے کیا کہتے ہیں، کیونکہ یہ حقیقت ہے شاید تمہیں اس پر اعتبار آئے یا نہ آئے کہ جن لوگوں نے تمہاری زندگی تم سے چھینی ہے ان ہی لوگوں نے میرا وطن، میرا شہر، میری گلی مجھ سے چھین لی ہے۔ اور جس طرح تم آج اپنے گھر واپس نہیں جا سکتے، میں بھی اپنی گلی کو لوٹ نہیں سکتا ...

.... کہ یہ سب محض ایک اتفاق ہے، ایک اتفاق جابر، ایک ظالم قسمت جس نے تم سے اور مجھ سے یہ سلوک کیا یا کہ ایک خوفناک ظالمانہ سازش ہے چند سیاستدانوں کی اور ظلم پرور قوتوں کی جنہوں نے تم سے تمہاری زندگی اور مجھ سے میرا وطن چھینا ہے۔ تمہیں اور مجھے دونوں کو مل کر اس سوال کا جواب تلاش کرنا ہے۔ ماضی اور حال کو ملا کے مستقبل کا راستہ ڈھونڈنا ہے۔

یہ سچ ہے کہ میں تمہارے امریکہ کبھی نہیں گیا ہوں۔ مجھے کبھی پاسپورٹ ہی نہیں ملا نہ انگریزی سرکار نے دیا نہ ہی کانگریسی سرکار نے۔ اس پر بھی میں تمہارے امریکہ کو اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کے خدوخال کی تمام تر رعنائی اور اس کی اندرونی بدصورتی ہی مجھ پر آشکارا ہے امریکہ کا چہرہ میں نے پہلے پہل ایک چھوٹی سی کہانی میں دیکھا اپنی انگریزی کی پہلی کتاب میں۔ یہ امریکہ کے پہلے صدر جارج واشنگٹن کی کہانی تھی کس طرح وہ سچ بولتا تھا اور سچ پر عمل کرتا تھا۔ اس کہانی نے مجھے اپنے بچپن میں بہت متاثر کیا اور میں سمجھتا رہا کہ امریکہ سچ بولنے والوں کا ملک ہوگا۔ جہاں کوئی بھی جھوٹ نہیں بولتا۔ پھر میں بڑا ہوا تو میں نے مزید تعلیم حاصل کرنے کے لیے لاہور میں ایک امریکی کالج میں داخلہ لے لیا۔ فارمن کرسچن کالج لاہور میں۔ یہاں پر میں نے ان عظیم امریکی عوام کا چہرہ دیکھا جنہوں نے انگریزی شہنشاہیت کے خلاف آزادی کی جنگ لڑی جنہوں نے غلامی کے خلاف جنوبی امریکہ سے اپنے ہی بھائیوں سے حق وصداقت کے لیے خانہ جنگی کی اور غلام حبشیوں کو آزادی دلانے کی پوری کوشش کی اور جن کے لیے دنیا کی دوسری قوموں کے دلوں میں بڑی عزت اور محبت ہے۔ ایسے امریکہ کو میں سر جھکا کے سلام کرتا ہوں۔ آزادی کا جذبہ، آزادیٔ تحریر و تقریر کی قدر و قیمت بھی مجھے اپنے امریکی پروفیسروں سے ملی ہے۔ جمہور پر بھروسہ کرنا میں نے ان ہی سے سیکھا۔ میں نے ابراہام لنکن کو دیکھا، امریکہ کے ساحل پر ایستادہ آزادی کی دیوی کو دیکھا اور ان نبرد آزما جری بہادروں کے کارنامے

پڑھے، جنہوں نے امریکہ کے قبائلی منظر کو ایک جاندار شاندار پھیلتے ہوئے جیتے جاگتے وسیع تمدن میں تبدیل کر دیا۔ وہاں پر میں نے مارک ٹوین، ڈری زر، اور والٹ وٹمین کو پڑھا۔ جس نے اپنی نظموں میں مجھ سے اسطرح گفتگو کی، جیسے وہ میرا ہمسایہ ہو اور ساتھ والے گھر میں رہتا ہو، اور پھر ایک روز ناریخ کے پروفیسر نے مجھے ایک گراموفون ریکارڈ تحفے میں دیا یہ پال روبسن کا گیت تھا اور مجھے اس کے نغمے میں تخلیق کا سارا درد اور راس کی ساری خوشی مستور نظر آئی اور میری نگاہوں میں امریکی وادیوں میں ڈیفوڈل کے پیلے پیلے لاکھوں پھول کھلتے گئے، اور لاکھوں بازو اپنی صاف ستھری دیانتدار انگلیوں سے امریکہ کا کارخانے چلانے لگے۔ میں نے ہزاروں بچوں کی ہنسی سنی جو بستے بغل میں دبائے اسکولوں سے واپس آرہے تھے اور اس ہنسی کے ساتھ میں نے ان سینکڑوں ندیوں کی ہنسی سنی جو رائی کے گھنے جنگلوں میں سب کی نظروں سے دو پریوں کی طرح محو خرام رہتی ہیں۔ حیرت ہے کہ پال روبسن کا ایک نغمہ اپنی تنہائی میں کیا کچھ سمیٹ لاتا ہے۔ امریکہ کا لاحدود حسن اور اس کا سندر سجل روپ .... میں پال روبسن کا اور اپنے دوسرے امریکی دوستوں کا شکر گزار ہوں۔ ان کی مدد سے میں نے اپنی ناواقفیت کی نقاب الٹ کر امریکی عوام کا خوبصورت چہرہ دیکھا ہے۔ یہ عوام تو بالکل میرے اپنے وطن کے عوام جیسے ہیں۔ بالکل اسی طرح سیدھے سادے محبت کرنے والے صاف دل لوگ جیسے میرے وطن کے لوگ ہیں۔

لیکن ایک دوسرا امریکہ بھی ہے۔ عوام کا امریکہ نہیں، عوام کا حق غصب

کر کے ان پر حکومت کرنے والوں اور فوجی راہنماؤں اور بڑے بڑے تاجروں کا، امریکہ۔ امریکہ جو فورڈ کا ہے، ڈلر کا ہے، ڈوپاں کا ہے، راک فیلر اور مورگان کا ہے اور دوسرے سینکڑوں ایسے تاجروں اور بینکروں کا ہے جن کا نام بھی میں نہیں جانتا، لیکن اتنا ضرور جانتا ہوں کہ یہی وہ امریکہ ہے جس نے تمہیں کوریا میں موت کے گھاٹ سلایا ہے اور جن کا ہاتھ اگر کبھی مجھ پر پڑ جائے تو مجھے بھی موت کے گھاٹ اتار دینے میں کوئی کسر نہ چھوڑیں گے۔ یہ عظیم تجارتی سونے، چاندی، لوہا، کوئلہ، آلو، تیل، زہریلی دواؤں اور اسلحہ جات کی سامراجی کوٹھیوں کے مالک یہی وہ لوگ ہیں جو ہر جاندار یا غیر جاندار شے کو شخصی منافع کے لیے بیچتے ہیں، جنہوں نے تمہیں بھی ایک تھوڑے سے منافع کے لیے کوریا میں بیچ دیا ہے۔ شاید تمہارے ہاتھ میں بندوق دیتے وقت انہوں نے تمہیں راز نہیں بتایا ہوگا، تم سے صرف یہ کہا ہوگا کہ تم امریکی قوم کے حقوق کی حفاظت کرنے کوریا جا رہے ہو، تمہیں اس وقت ان راہنماؤں سے پوچھنا ہوگا کہ وہ کون سے امریکی حقوق ہیں اور وہ کوریا میں کیا کر رہے ہیں کیونکہ ان حقوق کو واپس امریکہ میں مغربی ورجینیا میں نہیں بلا لیا جاتا جہاں میں وطنیت کے ایک صحیح اور جامع جذبے سے سرشار ہو کے ان کی حفاظت کر سکتا ہوں؟ شاید کہ تم نے بڑی سخت غلطی کی جو تم نے اپنے رہنماؤں سے یہ سوال نہیں پوچھا، تم نے اس کی بڑی سخت سزا بھگتی ہے میں جانتا ہوں کہ تم اس کے لیے اکیلے زیادہ گناہ گار نہیں ہو، میں تمہیں الزام نہیں دیتا کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ امریکی سامراجی تاجر کتنے شریف اور چالاک ہوتے ہیں، جاپان سے جنگ چھڑنے سے ایک روز قبل پرل ہاربر کے دن تک یہ تاجر

چاپان کو لوہا بھیج رہے تھے دو سینٹ کے منافع کے لیے انہوں نے اپنے ملک
کو بیچ ڈالا اور تمہیں تو شاید انہوں نے دو سینٹ کے منافع کے قابل بھی نہیں سمجھا
اور ابھی تمہاری طرح ہزاروں امریکی شیڈرک گومیوں کا نشانہ بنیں گے اور پھر
جا کے کہیں انہیں سمجھ آئے گی کہ اب تک وہ جس چیز کے لیے لڑتے رہے وہ
امریکی جمہوریت نہیں تھی، وہ کوئلے کا ایک ٹھیکر تھا جس پر کوریا والوں کا حق تھا
وہ مٹی کے تیل کا ایک قطرہ تھا جس پر فلسطین کا حق تھا، وہ ربڑ کا ایک درخت
تھا قلعی کی ایک کان تھی جس پر ملایا والوں اور ہند چینی والوں کا حق تھا تم جمہوریت
پھیلانے نہیں آئے تھے، دوسروں کا حق غضب کرنے آئے تھے، یہ تمہاری
غلطی تھی کہ تم نے اپنے رہنماؤں سے اس بارے میں کچھ نہیں پوچھا، میں سمجھتا
رہا کہ انسان دنیا میں بہت سے کام یوں ہی کرتا ہے، عدم توجہی سے کرتا ہے
لیکن میں یہ بھی سمجھتا ہوں کہ جب ایک آدمی اپنے ہاتھ میں بندوق اٹھاتا ہے
اور دوسرے گھر میں گھستا ہے تو اسے اپنے آپ سے بہت سے سوال کرنے
چاہئیں۔ کیا یہی راستہ ہے؟ اس کے علاوہ اور کوئی راستہ نہیں، کیا میں
راستی پر ہوں، کیا ایک دوسرے کے گھر میں گھسنے کا مجھے کوئی حق ہے؟ یہ
سوال بندوق اٹھانے سے قبل ضرور طے کر لینے چاہئیں کیونکہ بندوق زندگی
لیتی ہے۔ دیتی نہیں اور ہمارے ایشیا میں تو ایک بہت ہی خوبصورت دستور
ہے ہم لوگ اگر مانگنے کے لیے کسی کے گھر جاتے ہیں، تو بندوق نہیں لیجاتے
پھول لے جاتے ہیں اور میں نے سنا ہے کہ تمہارے مغربی دنیا میں بڑے
ہی خوبصورت پھول ہوتے ہیں، میرے دوست! تم ایشیا میں پھول نہیں

لائے بندوق لائے. اس لیے امریکی ایشیائی تعلقات کی کہانی اس قدر اداس اور دردناک کہانی بن گئی. یہ کہانی آج سے بہت عرصہ پہلے شروع ہوئی تھی ۱۸۵۳ء میں امریکی کموڈور پیری اپنے چھوٹے سے بحری بیڑے کی کمان میں جاپان کے ساحلوں پر نمودار ہوا اور بندوق اٹھا کے کہنے لگا اپنے ملک کے سارے دروازے کھول دو اور امریکی تجارت کو اندر آنے دو ذرا یاد کرو کہ ۱۸۵۳ء میں پیری جاپان میں نمودار ہوا اور ۱۸۵۹ء میں نکلسن دلّی کا دروازہ کھٹکھٹا رہا تھا اور باسفورس سے بنکاک تک اور اس سے اور آگے تک ہمارے ایشیائی ملکوں میں برطانوی، پرتگیزی، فرانسیسی، اور ولندیزی، سامراجیوں کی لوٹ مچی ہوئی تھی. یہ لوگ جو دراصل منافع اور لوٹ کھسوٹ کے لئے ایشیا آئے تھے. اور دنیا کو یہ کہہ کر ٹھگتے تھے کہ وہ جاہل اور وحشی ایشیا میں عیسائی تہذیب و تمدن کا رواج دینا چاہتے ہیں آج جبکہ ایشیا کے ہر ملک میں محب وطن اپنی آزادی کے لیے جان کی بازی لگا رہے ہیں سامراجیوں نے وہ نعرہ ترک کر دیا ہے. آج ان کا نعرہ ہے، ہم اشتراکیت کو کمیونزم کو ایشیا میں نہیں آنے دیں گے. ہم اپنی جمہوریت پھیلائیں گے. آج نعرہ بدل گیا ہے. بغرے باز نہیں بدلے یہ وہی موت کے سوداگر ہیں بھیس بدل کر آئے ہیں. لیکن میں ان کا چہرہ اس نقاب کے اندر بھی صاف صاف دیکھ سکتا ہوں اور چاہتا ہوں کہ تم بھی اسے دیکھو اور تمہاری طرح دوسرے لاکھوں امریکی نوجوان بھی دیکھیں جنہیں جنگ کا ایندھن بنایا جا رہا ہے، یہ اس دوسرے امریکہ کا چہرہ ہے جو اپنی ڈالری شہنشاہیت

پر سخاوت اور خیرات کی نقاب اوڑھے ہوئے ہے، اس نقاب کو الٹ دو دوست، اس سے اس کا خاتمہ قریب آجائے گا۔

میں تمہیں امریکی اور مغربی سامراجیوں کی کہانی سنا رہا تھا۔ ۱۸۵۰ء میں چین میں محب الوطنوں نے باگسر کی بغاوت اٹھائی لیکن مغربی سامراجیوں نے مل جل کر اس بغاوت کو بڑی سختی سے کچل دیا۔ اور اس پانچ ہزار سال پرانے تہذیب ملک کے دروازے پھر اس اجنبی ڈاکو کے لیے وا کر دیے گئے جو اندر آ کے چینی عوام کی محنت لوٹنا چاہتا تھا، اس کے دریاؤں پر قبضہ جمانا چاہتا تھا۔ اس کی کانوں کی دولت اور قیمتی پیداوار سے چینی عوام کو محروم رکھنا چاہتا تھا۔ اور ان کی وطنی عزت اور حرمت کو پاؤں تلے روند دینا چاہتا تھا، چنانچہ یہ سب کچھ ہوا اور پہلی جنگ عظیم لڑی گئی اور پھر دوسری جنگ عظیم جس کے آخر میں بظاہر ایسا معلوم ہوتا تھا کہ سارا چین اور سارا جاپان امریکی سامراجی اقتدار تلے آگیا ہے اور پھر کوریا بھی، کوریا کے بیچ میں اڑتیسویں عرض البلد کے نیچے سارے علاقہ پر امریکی ڈالر نے اپنے پاؤں جما لیے اور اس طرح کوریا کا یہ خوب صورت ملک بھی ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا جس کا تہذیبی سلسلہ کم از چار ہزار برس پرانا ہے۔ اگر میں تم سے کہوں کہ یہ انسانیت کے خلاف اک جرم ہے تو شاید بے جا نہ ہوگا، کیونکہ آج تک کسی قوم کا دل اس طرح طول البلد اور عرض البلد کی لکیروں سے ناپا نہیں گیا ہے کوریا ایک طویل عرصہ سے ایک ملک ہے، ایک قوم ہے ایک زبان ہے، ایک گیت ہے اور مغربی اور امریکی سامراجیوں کی تمام تر سازشوں اور جنگوں کے بعد بھی ایک

رہے گا ۔ ایسا میرا اعتقاد ہے کہ آج کسی بھی اجنبی طاقت یا قوت کو یہ حق نہیں کہ وہ ایک قوم کے دو ٹکڑے کر دے اور ہوا ایسا کرتا ہے ہم اسے جمہوریت پسند نہیں کہتے ، اسے جمہوریت دشمن کہتے ہیں ۔

کوریا پر کوریا والوں کا حق ہے ، جس طرح امریکہ والوں کا حق ہے ۔ وہ جس طرح چاہیں اس کی قسمت بنائیں بگاڑیں ، جس طرح کی حکومت چاہیں بنائیں لیے رہنما چنیں اپنا معاشی اور سیاسی نظام بدلیں اور انہیں اس بات کا پورا پورا اختیار ہے کہ ان کی اندرونی اور خارجی پالیسی کیا ہوگی ، ان کے جھنڈے کا رنگ کیا ہوگا ، اور ان تمام باتوں پر ان کا حق فائق ہے ، اور کسی اجنبی کو یہ حق نہیں ہے کہ ان کے متعلق اپنا فیصلہ ان پر ٹھونس دے ۔ اگر کوریا کے لوگ آپس میں مل بیٹھ کر صلح صفائی سے اس معاملہ کو طے کر لیتے ہیں تو بہت ہی اچھا ہے ، لیکن اگر وہ اس معاملہ کو اپنی ذاتی بھی خانہ جنگی سے طے کرتے ہیں تو بھی کسی دوسرے کو اس میں بولنے کا حق ہے ... وہ صلاح دے سکتا ہے اس خانہ جنگی کو اچھا یا برا کہہ سکتا ہے ، لیکن بندوق اٹھا کے ان کے گھر میں نہیں گھس سکتا ۔ آخر امریکہ میں بھی تو خانہ جنگی ہوئی تھی اور شمالی امریکہ والوں نے جنوبی امریکہ والوں سے غلامی کے خلاف خانہ جنگی کی تھی اور کئی سالوں تک لیکن بیچارے کوریا والوں نے تو اس خانہ جنگی میں کوئی مداخلت نہیں کی اور برطانیہ کی خانہ جنگی بھی ہمیں یاد ہے ، جب انہوں نے اپنے بادشاہ چارلس اول کا سر قلم کر دیا تھا ، اس وقت بھی شاہ کوریا نے برطانیہ کی شاہیت کی حمایت کرنے کے لیے اپنے سپاہی برطانیہ میں نہیں بھیجے تھے تو پھر آج کیوں

برطانیہ کوریا کے سمندر میں اپنا بحری بیڑا بھیج رہا ہے کس لیے؟ کیا اڑتیسویں عرض البلد کی حفاظت کے لیے؟ یہ بھی عجیب مذاق ہے، کوئی تعجب نہیں کہ اگر واقعات کی یہی رفتار رہی اور امریکی سامراجی کو دیا سے اسی طرح بھاگتے رہے تو ایک روز برطانیہ کو خطِ استوا کی حفاظت کرنی پڑ جائے۔

لیکن آج ایشیائی اس اڑتیسویں عرض البلد کے ڈھونگ سے اچھی طرح واقف ہو چکے ہیں۔ انہیں اچھی طرح معلوم ہے کہ امریکی سپاہی لڑائی اڑتیسویں عرض البلد کو بچانے کے لیے نہیں بلکہ اس دوسرے عرض البلد کو بچانے کے لیے بھیجے جا رہے ہیں جو ایشیا کے دل کو ایک سرے سے چیرتا ہوا دوسرے سرے تک جا نکلتا ہے۔ یہ ظالم سامراجی عرض البلد جس ملک سے گزرتا ہے، اس کے دو ٹکڑے کر دیتا ہے۔ فلسطین سے گذرتا ہے تو فلسطین اسرائیل اور عرب میں منقسم ہو جاتا ہے۔ برما سے گذرتا ہے، تو ہندوستان بھارت اور پاکستان میں تقسیم ہو جاتا ہے۔ برما سے گذرتا ہے تو کیرن ریاست اور ایرادری ریاست میں تقسیم ہونے لگتا ہے، انڈونیشیا سے گزرتا ہے، تو نیوگنی انڈونیشیا سے الگ ہو جاتا ہے۔ ہند چین سے گذرتا ہے تو ویت نام کے مقابلہ پر باؤ دائی کی کٹ پتلی حکومت ظہور میں آ جاتی ہے۔ یہ عرض البلد ایشیائی قوموں کو ملاتا نہیں ہے، کمزور کرتا ہے تاکہ وہ بدستور محکوم رہیں اور سامراجیوں کے تسلط کے نیچے دبی رہیں مغربی سامراج پہلے تو ایشیائیوں میں سے اپنے لیے دلال اور کٹ پتلیاں ڈھونڈتا ہے انہیں اپنے مفاد کے لیے استعمال کرنے کے لیے انہیں سچے قومی رہنما بناتا ہے اور دوسرے محب وطنوں کو

"کمیونسٹ" کہہ کر عوام کو گمراہ کرنے کی کوشش کرتا ہے اور پھر ان نام نہاد سچے قومی رہنماؤں کی چھتر چھایا میں اپنی سامراجی لوٹ کھسوٹ جاری رکھتا ہے۔ جنگ سے پہلے اور جنگ کے بعد بھی یہی ہوتا رہا ہے لیکن جنگ کے بعد جب پورے ایشیا میں قومی تحریکیں زور سے ابھریں تو سامراج نے زیر زمین پناہ لی اور اپنے دیسی ایجنٹوں اور دلالوں کو اوپر اچھال دیا لیکن جب ان سے بھی کام نہ بنا تو خود بندوق لے کر کوریا میں کھڑا ہو گیا۔ یہ سامراج کی آخری لڑائی ہے۔ دوست! اسی لیے یہ بندوق کی گولی آج تمہارے سینے کے پار ہوئی ہے۔

میں چاہتا ہوں کہ تم اس معاملے کو اچھی طرح سمجھ لو اور تمہاری طرح دوسرے ہزاروں لاکھوں امریکی نوجوان بھی اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لیں کیونکہ ان کی اس سوجھ بوجھ پر دنیا کے امن کا دارومدار ہے آج امریکی عوام اور امریکی نوجوانوں پر ایک بڑی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ اور میں امید کرتا ہوں کہ یہ سب لوگ اس کی تاریخ کے تقاضوں کو پورا کرنے میں ضرور ہماری مدد کریں گے کیونکہ یہ لوگ ایک ایک کر کے لاکھوں پرائیویٹ شیڈرک بن جاتے ہیں۔ اس لیے انہیں اپنے امریکی حاکموں سے جنہوں نے کوریا میں یہ جنگ چھیڑی ہے ضرور یہ کہنا چاہیے کہ وہ اس جنگ میں سامراج کے ساتھ نہیں ہیں بلکہ ایشیائی عوام کے ساتھ ہیں۔ انہیں ضرور یہ کہنا چاہیے کہ ہم ایشیا میں کسی "ازم" کے خلاف نہیں لڑنا چاہتے، چاہے وہ کمیونزم ہو یا بدھ ازم۔ یہ ایشیا والوں کے لیے ہے۔ وہ جس "ازم" کو چاہیں رکھیں، ماریں، بڑھائیں

پھیلائیں، وہ اپنی قسمت کے مختار کل ہیں اور اگر امریکہ دوسری قوموں کی قسمتوں کا کل مختار بننا چاہتا ہے تو اس بے انصافی کی حمایت ہرگز نہیں کریں گے ہم سامراج کے تلے غلام نہیں رہیں گے، نہ یورپ میں، نہ امریکہ میں، نہ کوریا میں، نہ ایشیا کے کسی میدان میں، عوام کو خود ان کی تقدیر بنانے دو پھر دیکھو وہ کتنی اچھی تقدیر بناتے ہیں۔

میرے خط سے تم کہیں یہ نہ سمجھ لو کہ مجھے تمہاری موت کا افسوس نہیں ہے۔ ایسا نہیں ہے بات صرف یہ ہے کہ آج میری آنکھوں میں تمہارے لیے آنسو نہیں ہے میں اپنے آنسو بہت عرصہ ہوا بہا چکا ہوں۔ اپنے دل میں اتنی غریبی اور سماجی بے انصافی دیکھی ہے کہ اسے دیکھ کر میری آنکھوں کے آنسو ختم ہو گئے ہیں، مگر میں تمہاری موت پر افسردہ اور سوگوار ہوں۔ میرے دل میں تمہارے قاتلوں کے خلاف غم اور غصے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہے۔ لیکن تمہارے اصلی قاتل کون ہیں، کیا وہ شمالی کوریا کا سپاہی جس نے اپنے اور اپنی بیوی اور بچوں کی حفاظت کا خیال کرتے ہوئے تمہارے سینے میں گولی اتار دی یا کوئی اور یہ بھی ایک دلچسپ کہانی ہے سنو گے۔

۱۹۰۵ء میں جب کہ روس اور جاپان کے درمیان لڑائی ہوئی تھی اور جاپان ساری مخالفتیں طے کرتا ہوا چین میں گھس گیا تھا، یہ ان دنوں کی بات ہے کہ فتح مند جاپان کی فوجوں کے ہمراہ ایک نوجوان امریکی لفٹنٹ بھی تھا جو ویسٹ پائنٹ امریکہ سے بھیجا گیا تھا اس فوجی افسر کا نام میک آرتھر تھا اور یہ لفٹنٹ بظاہر ایک غیر جانب دار فوجی مبصر کی حیثیت سے جاپانی فوجوں کے ہمراہ سفر کر رہا تھا۔ اب

جب میں اس سارے واقعے پر غور کرتا ہوں تو مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ شاید یہ لفٹننٹ میک آرتھر ۱۹۰۵ء میں بھی امریکہ سامراجی اتہ یورپ کے ایشیا میں اپنے لیے نئی تجارتی منڈیاں ڈھونڈ رہے تھے اور ایشیا کے ملکوں پر اپنی حریصانہ نگاہ جمائے بیٹھے تھے مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ۱۹۰۵ء میں لفٹننٹ میک آرتھر جس مشن پر آیا تھا وہ بڑی مشکل سے ۱۹۴۵ء میں پورا کر سکا، مجھے یہ گمان سا ہوتا ہے کہ ۱۹۰۵ء میں جب وہ امریکی لفٹننٹ کوریا کے سمندر میں اپنے جہاز پر سوار تھا تو وہ تمہاری ولادت سے بہت پہلے تمہاری موت کا حکم سنا گیا تھا، آج جب میں اس امر پر غور کرتا ہوں تو اس طرح ٹھنڈے دل سے غور کئے ہوئے تمہارے قتل پر میری آنکھوں میں آنسو نہیں آتے، غصے کے شعلے بلند ہوتے ہیں ان جابروں کے خلاف جنہوں نے انیس اور بیس برس کے امریکی لڑکوں کو کوریا کی قتل گاہ میں جھونک دیا، ان لڑکوں کو ابھی اسکولوں اور کالجوں میں پڑھنا تھا، انہیں تو جنگ کا کھیل نہیں فٹ بال اور ہاکی ٹینس اور بیس بال کھیلنا تھا، ان کے سامنے ان کی پوری جوانی تھی جسے بسر کرنے کا انہیں پورا پورا حق تھا، یہ حق جس نے تم سے چھینا ہے میں اپنی آنکھوں میں آنسو لے کر اس کے خلاف نہیں لڑ سکوں گا، اس لیے کہ آج تمہارے لیے میری آنکھوں میں آنسو بہتے ہیں۔

مگر اس سے کہیں یہ نہ سمجھنا کہ مجھے تمہاری موت کا افسوس نہیں ہے، شاید تمہارے جنرل میک آرتھر کو بھی تمہاری موت کا اتنا افسوس نہیں ہوگا، جتنا مجھے ہے کیونکہ جنرل میک آرتھر کے لئے تمہاری حیثیت اس کے فوجی نقشے پر ایک چھوٹے سے پن سے زیادہ نہیں ہے لیکن میں جانتا ہوں اور اسے اس سے

پہلے بھی ایک بار کہہ چکا ہوں کہ جب میدان جنگ میں ایک سپاہی مرتا ہے تو کیا ہوتا ہے۔

جب سپاہی کینتھ شیڈرک عمر ۲۰ سال ساکن مغربی ورجی نیا، امریکہ کوریا کے میدان جنگ میں مرگیا، کوئی سماج کی طرح خوبصورت عمارت مرگئی، سائنس کی کوئی نئی ایجاد علم فن کا کوئی لافانی خیال مرگیا جو آج تک کسی نے دریافت نہیں کیا۔ اور ساری دنیا کو اپنے پیچھے غمزدہ اور سوگوار چھوڑ گیا، شاید شیڈرک کی موت جنرل میک آرتھر کے لیے ایک پن کا نقصان بھی نہیں ہے۔ لیکن آج وہاں جہاں ان سے محبت کرنے والے یا ندار لوگ بستے ہیں، وہ سچے دل سے شیڈرک کی موت کے لیے سوگوار ہیں کیونکہ انہیں معلوم ہے کہ یہ موت بے کار تھی اس لیے کوئی اچھا مصرف نہیں تھا کیونکہ یہ دھرتی جاری جس پر آج اس کا حال اتنا پتلا ہے، اپنی تمام صحرائی خوابوں کے باوجود بڑی ہی پرکشش اور خوبصورت جگہ ہے یہاں پر زرخیز کھیت اور وادیاں ہیں جن میں گیہوں، جو، باجرا، مکئی، دھان، روئی، پٹ سن کی کھتیاں لہلہاتی ہیں۔ یہاں پر سینکڑوں ہزاروں ایسی گھاٹیاں ہیں اور اونچے اونچے کوہستانی سلسلے ہیں جن کی گودمیں زمرد کی طرح چمکتے ہوئے جنگل کھڑے ہیں اور جن کی چٹانیں سونے، چاندی، جست اور ابرق سے جگمگا رہی ہیں۔ یہاں پر میلوں تک پھیلے ہوئے دریا اور وسیع جھیلیں ہیں جو اپنی کنواری چھاتیوں میں بجلی کی قوت اور گرمی کو ماتا کے دودھ کی طرح چھپائے ہوئے ہیں۔ یہاں ہم سب لوگ آرام سے اور سکون سے اور بڑھتی ہوئی ترقی کے ساتھ رہ سکتے ہیں۔ یہ دھرتی اتنی امیر ہے، اتنی پیاری ہے، اتنی دولتمند ہے۔ اگر ہم کوشش کریں تو وہ

ہماری بڑی سے بڑی خواہشوں کو پورا کرنے کی قوت رکھتی ہے۔

اور اگر کہیں ہم اس دنیا سے پرے کائنات کے دوسرے گوشوں پر نگاہ ڈالیں تو ہمیں لاکھوں شمس و قمر، کروڑوں ستارے فضاء بسیط میں گھومتے نظر آئیں گے اتنی ان گنت دنیائیں کہ اگر تھوڑی کوشش کرے تو ہر انسان کے لیے ایک ستارہ مل سکتا ہے، کائنات کا یہ پھیلاہوا عظیم الشان لامتناہی سلسلہ ہزاروں سالوں سے انسان کی جرأت آزمائی کا منتظر ہے، ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم کوریا کے ایک چھوٹے سے ٹیلے پر لڑنے کی بجائے اپنی نگاہیں زمان و مکان کی آخری حدوں تک پھیر دیں، ضرورت اس امر کی ہے کہ ہم کروڑوں اربوں روپیہ ایٹم بم اور ہائیڈروجن کی خطرناک اور انسان کش بارود میں تباہ نہ کرتے ہوئے اس روپیہ کو علم اور سائنس اور فن کے صحیح مصرف میں لائیں تو انسان سچ مچ انسان بن کے کائنات کے مرکز میں کھڑا ہو سکتا ہے۔

یہ میرا گہرا اعتقاد ہے اور کامل یقین ہے اور جب میں یہ چند آخری سطریں تمہیں لکھتا ہوں تو میری نگاہ ایک لمحہ کے لیے سامنے کی کھڑکی سے باہر کے منظر پہ جاتی ہے اور جہاں میں بیٹھا ہوں وہاں سے مجھے قدرت کا ایک حسین اور پرسکون منظر دیکھنے کو ملتا ہے، پنکھے کی طرح پھیلے ہوئے ناریل کے سبز و شاداب پتے تاڑ کے لانبے پلکے کھمبوں پر جھولتے ہیں، جو اندھیری کی پہاڑیوں سے فراز و نشیب میں گرتے ہوئے دور تک چلے گئے ہیں ان کے پرے ورار کی وہ خوبصورت پہاڑیاں اور ٹیلے ہوں جن کی وسعت میں کتنے ہی انجانے آسمانوں کی نیلاہٹیں لیے جگمگا رہے ہیں، اور میں سوچتا ہوں وہ ان ٹیلوں میں نہ سے مستور، اور مجھے تمہارا خیال آتا ہے، سپاہی کیتھ شیڈرک مغربی ورجینیا کے رہنے والے، اور مجھے خیال آتا ہے، ان دوسرے

سینکڑوں شیڈرکوں کا جو تمہاری طرح ۲۰ سال کے ہیں اور مغربی ورجی نیا کے رہنے والے ہیں اور کنساس کے رہنے والے ہیں اور اوہیو اور سنتا ٹی میکسانہ، بوسٹن اور شکاگو کے رہنے والے ہیں، سپاہی کینتھ شیڈرک جو ابھی بیس سال کے نہیں ہوتے جو ابھی انیس اٹھارہ، سترہ، سولہ برس کے ہیں، پھر مجھے اس کینتھ شیڈرک کا خیال آتا ہے، جو ابھی صرف تین سال کا ہے اور جو میرا بچہ ہے اور میں سوچ سوچ کے کہتا ہوں نہیں، نہیں ایسا کبھی نہیں ہوگا، وہ اس میں سے پھر کوئی غلام نہیں گھڑ سکیں گے، وہ اس کے ہاتھ میں بندوق تھما کے کسی ٹیلے پر قتل کرنے کے لیے نہیں بھیج سکیں گے، اس لیے جب میں اپنی کھڑکی کے باہر دور اس ٹیلے پر تمہاری لاش دیکھتا ہوں تو اپنے لیے ایک فیصلہ کرتا ہوں۔ امن، امن آج اور ابھی، امن میرے زمانے میں، امن ہر زمانے میں — !

پہلا اور تیسرا

پہلے درجہ میں لوگ کفن کی طرح اُجلا لباس پہنے، سپرنگ والی نشستوں پر بیٹھے گاڑی کے جھٹکوں سے مومی تبوں کی طرح ہل رہے تھے، ان تبوں کے ہاتھوں میں اخبار تھے، یا چمکیلے امریکی ناول، کھڑکی کے قریب جو عورت بیٹھی تھی، وہ بھی ایک آبی تصویر کی طرح ساکت و جامد نظر آتی تھی، یہاں کوئی کسی سے بات نہ کرتا تھا، کوئی کسی کی طرف دیکھتا نہ تھا، یہاں خاموشی تھی، اور ایک طویل، گہرا سناٹا، اور رمیش کو معلوم ہوا جیسے وہ کسی ہزار ہا سال پرانے مندر میں آنکلا ہو، اور حیرت سے پتھر کے بتوں کو دیکھ رہا ہو۔۔۔۔

تیسرے درجے میں بڑی بھیڑ تھی، وہ بڑی مشکل سے اندر آسکا، اور ڈبے کے دروازے کے قریب ہی کھڑا ہو گیا، ذرا سی جگہ اُسے ملی جس میں وہ ایک پاؤں فرش پر ٹکا سکا، دوسرا پاؤں لٹکانے کی جگہ نہ تھی، دوسرا پاؤں اس نے ذرا پیچھے سرکایا تو سیاہ چمکیلے بالوں والی سانولی کرسچین حسینہ نے اس کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا مگر رمیش بھی مجبور تھا۔ اب اس کی ایک ٹانگ ٹخنے سے لے کر ران تک اس سانولی لڑکی کی ٹانگ سے چپک گئی تھی، اور اب وہ دونوں ٹانگیں گاڑی کی لے پر ڈبل اسپرنگ کی طرح حرکت کرتی تھیں۔ یہ محض اتفاق تھا، مگر انسانی جسم کو کیا کیا جائے، یہ بھی ایک مشین

ہے، جب تک یہ مشین چلتی ہے حرکت کرتی ہے اس سے نتائج مرتب ہوتے رہتے ہیں چنانچہ لڑکی کا ... وہ بے حد ملیح ہو گیا اور رمیش کو اس کے بالوں سے خوشبو بھی آنے لگی۔ اور لڑکی کے چہرے پر پسینے کی ننھی ننھی بوندیں پھوٹ نکلیں، جیسے پھول کی پتیوں پر شبنم بکھر جاتی ہے اور اس کے کان میں وہ آویزہ گاڑی کی لے پر ڈول رہا تھا، شاید اب رمیش کا دل بھی اس لے پر ڈول رہا تھا، اور اس کا جی چاہا کہ وہ اس عیسائی حسینہ کو اپنی باہوں میں لپٹا لے۔ اور اس کے چھوٹے سے ادھ کھلے دہن پر اپنے ہونٹ رکھ دے، وہ تو خیریت ہوئی کہ لوکل نان سٹاپ نہیں تھی، اگلے اسٹیشن پر رک گئی اور یہاں بہت سے مسافر اتر گئے اور دوسرے مسافروں کے ریلے کے اندر آنے سے پہلے اس عیسائی حسینہ نے اپنے لیے ایک سیٹ تلاش کر لی اور اپنے پھول دار نیلے سائے پر کمر سے کولھے تک ہاتھ پھیرتی ہوئی ایک ادھیڑ عمر کی ساہی گبر عورت کے پاس بیٹھ گئی، رمیش نے اور پھر اس عیسائی لڑکی نے ایک لمحے کے لیے محجوب نگاہوں سے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ اس ایک نگاہ میں کتنا ملال تھا پھر دوسرے لمحے میں جیسے وہ برقی رو ٹوٹ گئی، اور پھر ایک دوسرے کے لیے اجنبی ہو گئے، لیکن ان دونوں کے درمیان ایک ایسا لمبا لمحہ آیا تھا، جب وہ دونوں مکمل اجنبی ایک دوسرے سے اتنے قریب ہو گئے تھے، جیسے دو چاہنے والے ہی ہو سکتے ہیں، اور رمیش سوچنے لگا یہ انسانی جسم بھی کتنی عجیب و غریب مشین ہے جب برقی رو کٹ جاتی ہے تو جذبات کام نہیں کرتے اور جب تک برقی رو جاری و ساری ہے ساری کائنات رقص کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہے،

اور ریلے میں دو سرکاری چپراسی داخل ہوئے اور تین چار سادھو اور ایک

بھیک مانگنے والا جو مختلف جانوروں کی بولیاں بول کر پیسے مانگ رہا تھا۔ یہ بھک منگا دونوں آنکھوں سے اندھا تھا، اور اس کا سر گھٹا ہوا تھا، اور اس کے چہرے پر چیچک کے داغ تھے، اور وہ کبھی اپنا دایاں ہاتھ منہ پر رکھ کے اور کبھی بایاں ہاتھ اور دایاں ہاتھ دونوں اپنے منہ کے قریب لے جا کے مختلف آوازیں نکالتا تھا

یہ کوا بولتا ہے "کائیں کائیں"۔

اندھے تم نے کبھی کوا دیکھا ہے، جب وہ اپنے سیاہ چمکیلے پروں کو پھیلا کر نیلے آسمان میں پرواز کرتا ہے اور شریر بچوں کی طرح شور مچاتا ہے۔

یہ پہاڑی کوا ۔۔۔۔

پہاڑی کوا ؛ تو نے پہاڑ دیکھے ہیں اندھے، اونچے اونچے پہاڑ جن کی سر بفلک چوٹیوں پر سفید برف ہوتی ہے، جن کے سینے سے دو آبشار بہتے ہیں اور جنگل کے سبز پیراہنوں میں گلہریاں اور خرگوش، اور چھوٹے چھوٹے بندر اور لنگور، اور خوبصورت بدن والے تیتر اپنی زندگی کی خوبصورت تصویریں بناتے ہیں پھر کبھی کبھی کسی کھڑک کے تنے سے لگا ہوا کوئی ریچھ چاروں طرف دیکھتا ہے اور ہوا میں اپنی تھوتھنی کو اونچا کر کے شہد کے چھتوں کی خوشبو سونگھتا ہے۔

یہ ہوائی جہاز کی آواز ۔۔۔۔۔۔

تو نے ایلومونیم کا وہ سفید پرندہ نہیں دیکھا جو پروپلر گھماتے ہوئے چار انجنوں کا شور مچاتے ہوئے فضا میں اڑتا ہے اور جس کے پیٹ میں انسان اس طرح بیٹھے ہیں، جس طرح اس گاڑی کے ڈبے میں مسافر بیٹھے ہیں، مگر ہوائی جہاز میں ایسی بھیڑ نہیں ہوتی ایسے بھک منگے بھی نہیں ہوتے۔ وہاں آرامدہ کرسیاں

ہوتی ہیں۔ اور خوبصورت پردے ہوتے ہیں اور سیم تن نازک بدن حسین عورتیں مسافروں کو رنگارنگ کاغذوں میں لپٹے ہوئے سوندھے سوندھے چاکلیٹ کھلاتی ہیں۔

ماہی گیر عورت، جو بیڑی پی رہی تھی اس نے اندھے کو ایک آنہ دیا اور بولی "جا۔ اب دفان ہو کسی دوسرے ڈبے میں جا کے یہ بولیاں سنا بہت مغز چاٹ لیا ہے تو نے۔

اتنا کہہ کے وہ خوب پھیل کے بیٹھ گئی، عیسائی لڑکی پھر سمٹ گئی۔ ماہی گیر عورت نے اپنی خالی ٹوکری جس میں مچھلیوں کی باس رچی ہوئی تھی اپنے ہاتھوں سے خوب اچھی طرح تھپتھپائی اسے جھاڑ پونچھ کے سیٹ کے نیچے رکھدیا اور خوب زور زور سے بیڑی پینے لگی اور کرسچین لڑکی سے کہنے لگی "مچھلی تو بڑے شوق سے کھاتی ہے اور اب یہاں ناک پر رومال رکھتی ہے۔ تیری یہ ٹین ایسی ناک سڑ تو نہیں جائے گی۔ بھلا۔"

کرسچین حسینہ نے ناک سے رومال ہٹا دیا۔ آس پاس کے لوگ ہنسنے لگے۔ ماہی گیر عورت بھی ہنسنے لگی اور زور زور سے بیڑی پینے لگی، ہنسنے اور بیڑی پینے کے درمیان اسے کھانسی آگئی اب وہ ہنس رہی تھی اور بیڑی کا دھواں اس کے نتھنوں سے نکل رہا تھا۔ اور اس کی آنکھوں کے نیچے اور کنپٹیوں کے قریب کی جھریاں گہری ہو گئی تھیں اور کانوں میں سونے کا بوجھل دیگڑا کسی طلائی مچھلی کی طرح لٹک رہا تھا۔ جیسے مچھلی کانٹے میں پھنس کر بار بار تڑپ رہی ہو۔

ایک سادھو دوسرے سے مخاطب ہو کے کہنے لگا: کل نرگس کی نئی تصویر دیکھی ری بولی سینما میں واہ وا۔ مجا آگیا۔ رام جانے لڑکی کیا ہے، اطرت کا گھونٹ ہے۔ تو نے ری بولی کی تصویر دیکھی ہے۔؟

نہیں گورو! اپن کے پاس اتنے پیسے کہاں ہوتے۔ پرسوں میرے گورو کو سیٹھ چھبر مل کے ہاں دکشنا ملی تھی ساڑھے آٹھ آنے گورو نے مجھے بھی دیئے میں تو سرکس دیکھ آیا۔ مگر رام جانے سرکس کی چھوکریوں میں وہ دم نہیں ہے اب کے گورو نے آنکھ کھولی، وہ سیٹ پر ہی بیٹھے بیٹھے بھنگ اور چرس کے مراقبے میں چلے گئے تھے۔ اب کے انہوں نے اپنے چیلوں سے جو یہ گفتگو سنی تو انہوں نے ایک آنکھ کھولی اور شکایت کرنے والے چیلے سے کہا: کل تجھے دس آنے دوں گا۔ رام پان میں سوہجنا سامرتھ کو دیکھ آئیو۔ بالکل ستیا نا معلوم ہوتی ہیں۔ گنگا مائی کی طرح شتیل اور نرمل۔

چھوٹا چیلا ٹھنکنے لگا: نہیں گورو ہم تو نرگس کی نئی تصویر دیکھیں گے۔ سنا ہے اس میں ایک ڈانس بہت اچھا ہے۔

گورو بولے: ابے جا، وہ ڈانس کیا ہوگا۔ یاد ہے اپنے گاؤں کی وہ مہتاری چمارن گنگا میا کی سوگند لے لو۔ اس سے اچھا کون ناچے گی کیوں بے بھریے یاد ہے وہ برسات کا میلہ۔

بڑا چیلا اپنے ہونٹ تر کرتے ہوئے بولا: مہتاری کا تو جواب نہیں ہے۔ گورو میں تو سمجھتا ہوں۔ اب کے تم سردیوں میں دیس جاؤ تو اسے ساتھ ہی لیتے آؤ۔ بے کار میں اسے یہاں سے ہر مہینے منی آرڈر بھیجتے ہو یہیں ایک نام کمپنی کھول

دیں گے۔ کیوں ہے چچا۔

چچا بڑے گورو کا پاؤں دابنے لگا، ہاں گوروہ ہو جاؤ پھر۔

بڑے گورو مسکرائے۔ انہوں نے لنگوٹ کی تہہ میں ہاتھ ڈال کے ایک چونی اور تین دونیاں نکالیں۔ اور انہیں چھوٹے چیلے کی ہتھیلی پر رکھ کے کہا۔ جا تو بچہ ہے۔ ابھی ڈگس کی فلم دیکھ آ۔ میں تو موہ مایا سب تیاگ چکا۔ خالی رام کا نام لیتا ہوں۔ بڑے گورو نے اپنی آنکھیں بند کر لیں اور گانجے کے مراقبے میں چلے گئے۔

چند کلرک آمنے سامنے کی ڈیڈ سیٹوں پر بیٹھے بڑے زور سے بحث کر رہے تھے۔ ریلوے ہڑتال نہیں ہوئی اچھا ہوا کمیونسٹ بہت شور مچاتے تھے۔ سالوں کی بدھیا بیٹھ گئی۔ بہت اچھا ہوا۔

کیسے اچھا ہوا۔ ایک پارسی کلرک نے ناک میں گنگناتے ہوئے کہا۔

ارے ملک میں بڑا خطرہ تھا۔ بفروان جی بھائی۔ تم کیا جانو۔ گجرات میں کال پڑا تھا۔ اگر ہڑتال ہو جاتی تو لوگ بھوکے مر جاتے۔

اب کیا گجرات میں کال ختم ہو گیا ہے، مہنگائی ختم ہو گئی ہے، بھوک ختم ہو گئی ہے؟ تیسرا کلرک بولا۔

دوسرا کلرک بولا۔" ہاں اس کا جواب دو۔"

پہلا کلرک بولا۔ آہستہ آہستہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ ابھی تو اپنی حکومت آئے دو سال بھی پورے نہیں ہوئے۔

دوسرا بولا۔ دو سال ہی میں کیا کم ہوا ہے مہنگائی کہاں سے کہاں چلی

گئی سچ جانو میں نے چھ مہینے سے تیراب نہیں پہنی، بڑا لڑکا میں نے اسکول سے اٹھا لیا،

وہ کیوں؟

فیس دوگنی ہوگئی، کتابوں پر محصول لگا دیا، بچے کو کہاں سے پڑھاؤں، میں نے اسے واشنگ کے محکمے میں چپراسی کی ملازمت دلوا دی ہے دیکھ لینا ایک روز ترقی کرتا کرتا وزیر اعظم بن جائے گا،

سب کلرک ہنسنے لگے، پہلا کلرک کہنے لگا، مگر مجھے تو کمیونسٹوں کی ہار پر خوشی ہے، ہڑتال سے پہلے کتنا اچھلتے تھے،

تمہارے سوشلسٹوں نے عین وقت پر دھوکا دیا، پارسی بولا،

مگر کوئی تو آتا، کہیں پر تو کچھ ہوتا، سب بھیگی بلی بن کے بیٹھ گئے۔ ایک مزدور بھی نہیں اٹھا، اور یہ لوگ ہندوستان پر حکومت کرنا چاہتے ہیں، یہ گنوار مزدور اور آبڈ کسان، میں تم سے سچ کہتا ہوں کہ ان لوگوں کو جتنا دبا کے رکھا جائے اتنا ہی یہ ٹھیک رہتے ہیں، ذرا ڈھیل دے دو تو سر پر چڑھ جاتے ہیں سرکار نے ٹھیک کیا،

ایک اور آدمی بولا۔ نو مارچ کو دیکھا نہیں تھا چپے چپے پر پولیس اور فوج کا پہرہ تھا، ریل کی پٹڑی پر، اسٹیشنوں پر، کارخانوں پر، لوکو ورکشاپ میں، سنا ہے کوئی ہل نہیں سکتا تھا، حکم تھا، کوئی ذرا چین چپٹ کرے تو اسے گولی سے اڑا دو۔

ایک آدمی جس کی داڑھی بڑھی ہوئی تھی، اور جس کے رخسار اندر کو دھنسے ہوئے تھے، اور جس کے گھٹنوں پر تیل کے بڑے بڑے داغ تھے اور میل کی تہیں، اور جو بڑی بے چینی اور پریشانی سے یہ گفتگو سن رہا تھا، یکایک اٹھ کھڑا ہوا اور اس نے

اس کلرک کو جو گولی سے اڑا دینے کا ذکر بڑی شیخی سے کر رہا تھا، زور سے ایک طمانچہ مارا طمانچہ اس زور کا تھا کہ کلرک کا منہ دوسری طرف گھوم گیا، اور اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے، اتنے میں دوسرے لوگوں نے مزدور کو پکڑ لیا۔

مزدور نے زور سے اپنی باہیں چھڑائیں، اور کہا اب کے دیکھنا سالو۔

وہ لوگ اس پر پل پڑے، ایک کونے میں چار مارواڑی تاش کھیل رہے تھے انہوں نے زور زور سے چلانا شروع کیا۔ پکڑو، پکڑو، اسے یہ کمیونسٹ ہے مارو مارو اسے جان سے مارو، پولیس کے حوالے کر دو۔

مزدور لڑ رہا تھا، لیکن وہ اکیلا تھا۔ اور وہ بہت سارے تھے، پھر بھی وہ دو چار آدمیوں کو خاطر میں نہیں لا تا تھا، اس نے مدد کے لیے اِدھر اُدھر دیکھا۔ دور ایک کونے سے ایک آدمی اٹھا، اُس نے بڑے صاف ستھرے کپڑے پہن رکھے تھے، اُس نے آ کے کلرکوں کو پیٹنا شروع کر دیا، پھر ماہی گیر عورت بیڑی کا دھواں نکالتی ہوئی اُٹھی اور اس نے مچھلی والی ٹوکری لوگوں کے سر پہ دے ماری اور چیخنے چلانے اور گھونسے مارنے لگی، ایک گھونسا غلطی میں رمیش کے بھی لگا، اور اُسے معلوم ہوا کہ مچھلی بیچنے والی عورت کا گھونسا کتنا تگڑا ہوتا ہے، اور پھر ایک عورت آ گئی اور اُس نے بھی بڑے اچھے اور رنگین کپڑے پہن رکھے تھے۔ اور وہ بھی پھٹے پُرانے کپڑے پہنے ہوئے مزدور کی حمایت میں لڑنے لگی، ایک سادھو کا کمنڈل ایک مارواڑی کے سر پر اوندھا ہو گیا۔ اور اس میں سے دال چینی، چاول، سنگترے کی قاشیں، چنبیلی کے پھول بینگن کی بھاجی اور لپٹی ہوئی سُرخ مرچیں چاروں طرف پھیل گئیں، اور لوگ کھانسنے لگے۔ اور مارواڑی چلانے لگے اور کسی نے اُن کی تاش اٹھا کر باہر پھینک دی۔ کسی نے

پگڑی اچھال دی، اور وہ مارواڑی رونے لگے اور چلانے لگے کمیونسٹ آ گئے زنجیر کھینچو، ہڑتالی آ گئے، ہڑتالی آ گئے۔

یکایک گاڑی کھڑی ہو گئی، اور پھر پولیس آ گئی۔

جب مجمع ذرا چھٹا، تو معلوم ہوا کہ میلے میلے گھٹنوں والا مزدور غائب ہے، اور ماہی گیر عورت کا ٹوکرا اُلٹ گیا ہے، اور نوجوان عورت کا نگین لباس جگہ جگہ سے پھٹ گیا ہے، اصحاب ستھرے کپڑے پہننے والے نوجوان کا منہ تو بجا ہوا تھا اور اس کے ہونٹ سے خون نکل رہا ہے، لیکن ماہی گیر عورت کا زیادہ نقصان ہوا، ہاں وہ ان لوگوں کی گت دیکھ کر ہنس رہی تھی، جنہوں نے مزدور کو پکڑنا چاہا تھا، پولیس نے اُسے پکڑ لیا۔ مارواڑی ہاتھ بڑھا بڑھا کر گرجنے لگے، یہی تھی جو اس کے بیے لڑرہی تھی، اور یہ آدمی، یہ عورت، یہ جوان، یہ بابو، اور وہ کم بخت ہڑتال کرانے والا کمیونسٹ تھا اس کو انہوں نے بھگا دیا۔

ماہی گیر عورت نے چلانے والے مارواڑی کی طرف اپنی ٹوٹی ہوئی ٹوکری زور سے پھینکی، جو ٹھیک اس مارواڑی کے گلے میں آ دیزاں ہو گئی، سب لوگ ہنسنے لگے ماہی گیر عورت بولی تو لڑائی میں حصہ کیا لے گا، تو نہ مرد ہے، نہ عورت، تو دلال ہے دلال، دونوں طرف سے کمیشن کھاتا ہے تیرے جیسا مارواڑی ایک ہمارے دار سوا میں بھی تھا، وہ ہماری مچھلیوں کو اپنے ٹرکوں میں بھر کر شہر لے جاتا تھا اور سارا پیسہ خود ہڑپ کر جاتا تھا۔ اب ہم سارے گاؤں کے ماہی گیروں نے مل کر اپنی ٹرک لی ہے خود مچھلی سمندر سے نکالتے ہیں اپنی ٹرک میں لے جا کے شہر میں بیچتے ہیں، پہلے میرے کان میں ایک چاندی کی بالی نہیں تھی اب دیکھ یہ

سونے کا تمغہ ۔ اتری ۔ چپڑی ۔ بیوی کے پاس بھی ایسا نہ ہوگا ۔
پولیس والے اُس سے پوچھنے لگے کون تھا وہ ؟
وہ بولی ۔ وہ میرا بیٹا تھا ۔
ہاں ، وہ میرا بیٹا تھا ، وہ جہازی تھا ادار سوار ہیں ، جب جہازیوں کی ہڑتال ہوئی ، تو اس نے اکیلے پانچ گوروں سے لڑائی کی تم لوگ نہیں جانتے ہو اور اکھبارؤں میں بھی کسی کو معلوم نہیں ، مگر وہ میرا بیٹا تھا ، اور میں نے اپنی آنکھوں سے اُسے پانچ گوروں سے لڑتے ہوئے دیکھا ۔ اور آج جو آدمی یہاں سے بھاگا ، وہ بھی میرا بیٹا تھا کیونکہ وہ بھی اس طرح کی ہڑتال چاہتا تھا جس کے لیے میرا بیٹا مارا گیا ۔ اس لیے میں نے اسے بچالیا ۔ اب تمہارا جہاں جی چاہے لے چلو ۔
پولیس والوں نے اسے گاڑی سے نیچے اُتار لیا ۔ گاڑی کے چلتے چلتے رمیش نے دیکھا کہ وہ عورت پولیس والے سے ماچس مانگ رہی ہے ماچس لے کر اُس نے اپنی بیڑی سلگائی ، اور ماچس کی روشنی اس کی گہری آنکھوں میں چمک اٹھی ، اور اس کی آنکھوں کے نیچے اور کنپٹیوں کے اِدگرد جھریاں گہری ہوگئیں اور طلائی جھمکا اس کے کانوں میں بار بار غصے سے ہلنے لگا ، پھر گاڑی آگے نکل گئی ۔
رمیش ایک سیٹ پر بیٹھ گیا ، اس کے قریب ہی وہ نوجوان جس نے اچھے کپڑے پہنے ہوئے تھے ، اس نوجوان عورت کے قریب بیٹھا ہوا تھا جس کا رنگین لباس بھی جگہ جگہ سے پھٹ گیا تھا ۔ وہ نوجوان رمیش کی طرف دیکھ کے مسکرایا اور بولا " وہ بچ گیا ۔ اب ہاتھ نہیں آئے گا ۔ "
اس نے سر ہلا دیا ، میں جانتا نہیں ہوں ، مگر وہ بھی میری طرح کوئی مزدور

دکھائی دیتا تھا۔

رمیش نے پوچھا تم مزدور ہو؟ مگر تمہارے کپڑے تو .....

اس نے جواب دیا، ہمارا آج ہی بیاہ ہوا ہے۔ یہ بیاہ کے کپڑے تھے۔ میرے بھی اور اس کے بھی۔ اور اس نے اپنی بیوی کے شانے پر ہاتھ رکھ دیا.... بڑی مشکل سے یہ کپڑے سلائے تھے۔ خیر کوئی بات نہیں اپنا ساتھی تو بچ گیا۔

وہ اپنی نوجوان بیوی کی طرف دیکھ کے مسکرا دیا۔ اس کی بیوی نے اسے پیار بھری نظروں سے دیکھا، اور پھر اپنے ہاتھ میں رکھے ہوئے امرود کو اس نے دانتوں سے کاٹا اور لمبائی ہوئی ولیری سے اس چھوٹے امرود کو اپنے خاوند کے ہونٹوں پر رکھ دیا۔

نوجوان مزدور امرود کھانے لگا، اور اس کے مضبوط ہاتھ نے بیوی کو اپنے شانے سے لگا لیا۔

رمیش آہستہ سے وہاں سے اٹھ گیا۔ دوسری طرف ڈبے کے قریب مارواڑی اپنی پگڑیاں، اچکنیں اور دھوتیاں درست کر رہے تھے۔

ایک مارواڑی نے اپنی جیب سے تاش نکالتے ہوئے کہا، کیا ہوا مچھلی والی نے تاش باہر پھینک دی۔ ہمارے پاس دوسری تاش ہے۔

رمیش نے مارواڑیوں کے اوپر جھک کے کہا تمہارے پاس صرف ایک تاش ہے لیکن مچھلی والی کے پاس سارا سمندر ہے اور اس کی ساری مچھلیاں میں، تم اسے جیت نہیں سکتے ......

لوگ کفن کی طرح اجلا لباس پہنے اسپرنگ والی نشستوں پر بیٹھے گاڑی

لی ؑ کے پر موی بتوں کی طرح ہل رہے تھے ان بتوں کے ہاتوں میں اخبار تھے اور چکیلے امریکی ناول کھڑکی کے قریب جو عورت بیٹھی تھی وہ بھی ایک بے جان آہنی تصویر کی طرح ساکت وجامد نظر آتی تھی، یہاں کوئی کسی سے بات نہ کرتا تھا کوئی کسی کی طرف دیکھتا نہ تھا۔ یہاں خاموشی تھی اور ایک طویل گہرا سناٹا، اور رمیش کو معلوم ہوا جیسے وہ کئی ہزار سال پرانے مندر میں آنکلا ہو اور حیرت سے پتھر کے بتوں کو دیکھ رہا ہو۔ ●

سڑک کے کنارے

میں سڑک کے کنارے کنارے چل رہا ہوں اور جھیل ڈل کا نظارہ کر رہا ہوں۔ میں بہت مدت کے بعد کشمیر آیا ہوں، لیکن ڈل مجھے اسی طرح جوان اور خوبصورت نظر آتی ہے اس کے گہرے نیلے پانیوں میں شنکر آچاریہ کے مندر کا عکس لرز رہا ہے اور سرخ پردوں والے سبک خرام شکارے پانی کی سطح کو چیرتے ہوئے نشاط باغ کی طرف بڑھ رہے ہیں جب یہ شکارے پانی میں تیرتے ہوئے نیلوفر کے پھولوں کے قریب سے گذرتے ہیں تو نیلوفر کے خوابیدہ پھولوں پر پانی کی پھواریں پڑجاتی ہیں اور وہ چونک کے پانی کی سطح پر دوڑنے لگتے ہیں شکارے آگے بڑھ جاتے ہیں اور شکاروں میں بیٹھے ہوئے مرد و زن اور شکاروں مانجھیوں کا گیت ڈل کے اجلے اجلے پانیوں سے ابھرتا ہوا آرہا ہے،

باغِ نشاط کے گلو
شاد رہو جوان رہو
تم پر نثار جنتیں
روح افزا سرتیں
رنگ بہار نکہتیں

مست نغمے میں اتنے دن
خرم و شادماں رہو
باغِ نشاط کے گلو!

ہاں یہ میرا وہی جانا پہچانا کشمیر ہے جس کے بیٹوں نے ہزار مصیبتوں کے ہوتے ہوئے بھی اپنی حسن کاری نہیں کھوئی، اپنے گیت نہیں کھوئے، زندہ رہنے کی آرزو، اور ہنستے ہوئے محنت کرنے کی امنگ نہیں کھوئی، یہ میرا وہی جانا پہچانا کشمیر ہے۔

میں سڑک کے کنارے کنارے چل رہا ہوں۔ یہ سڑک جو سری نگر سے اننت ناگ کو جاتی ہے۔ اس راستہ میں شہتوت، چنار ہیں اور باداموں کے بانکے پیڑ، ناشپاتیوں کے جھنڈ اور سیب کے درخت، برف زمین میں گھل گئی ہے اور ابھی ابھی تو بہار کا سبزہ بن کر پھوٹی ہے۔ سیب کی شاخوں پر کلیاں چٹک گئی ہیں اور ان کی گلابی مسکراہٹیں جگہ جگہ رستہ چلنے والوں کے قدم روک لیتی ہیں۔ میں بھی یہاں ٹھٹھک جاتا ہوں کیونکہ یہاں سیب کے پھول ہیں ایک چشمہ ہے۔ ایک گائے ہے اور ایک حسین چرواہی ہے جو گائے کو چشمے سے پانی پلا رہی ہے۔ میں لڑکی سے کہتا ہوں "تم ذرا گائے کو پرے ہٹالو تو میں پانی پی لوں۔"

لڑکی: "تم ذرا پرے ہٹ کے بیٹھ جاؤ۔ اور گائے کو پانی پی لینے دو۔ وہ تمہارے سامنے سے ڈرتی ہے۔"

میں: "مجھے سخت پیاس لگی ہے۔"

لڑکی :- "پیاس انسان اور حیوان دونوں کو برابر لگتی ہے۔"

میں :- "پہلے میں پانی پی لوں۔"

لڑکی :- "پہلے گائے پانی پی لے۔ گائے کو دیکھتے نہیں جو پانی پی رہی ہے۔ اسے بیچ میں سے کیوں ہٹا دوں؟ تم پانی پی رہے ہوتے تو میں تمہارے ہاتھ سے پانی کا پیالہ چھین لیتی۔؟"

میں :- (ہنس کر) تم بڑی سمجھدار معلوم ہوتی ہو، مگر حیرت ہے اتنی سوجھ بوجھ رکھتے ہوئے بھی تم چرواہیوں کا کام کرتی ہو؟"

لڑکی :- چرواہیوں کے کام کے لیے تو بڑی سوجھ بوجھ چاہیے۔ گائے بھینسوں کے ریوڑ سنبھالنے کے علاوہ اسے تمہارے ایسے راہ پر چلتے ہوئے عقلمندوں سے بھی تو نپٹنا ہوتا ہے۔

(دونوں ہنستے ہوئے)

میں :- "تمہارا نام بیگماں ہے نا؟"

لڑکی :- (ہنس کر) "نہیں، میرا نام زینب ہے۔ میں یہاں گاؤں کے اسکول میں پڑھاتی ہوں۔"

میں :- "اسکول میں پڑھاتی ہو کہ گائے بھینس چراتی ہو؟"

لڑکی :- "یہ گائے تو ایک اندھے لڑکے کی ہے جس کے ماں باپ پنجاب کے فساد میں مارے گئے تھے، وہ اپنا وطن چھوڑ کے محنت مزدوری کے لیے پنجاب گئے تھے، پھر انھیں آنا نصیب نہ ہوا۔"

میں :- "یہ اندھا لڑکا کیسے بچ گیا؟ کیا یہاں تھا؟"

لڑکی :۔ یہ بھی اپنے ماں باپ کے ساتھ تھا کچھ فسادی اسے بھی مارنے پر تلے ہوئے تھے مگر پھر انہوں نے رحم کھا کر صرف اس کی آنکھیں نکال لیں اور اسے زندہ چھوڑ دیا اس نے اس دن سے کوئی فساد نہیں دیکھا۔ فساد کو سنا ہے صرف ایسی ایسی بھیانک آوازیں سنتا ہے کہ ہر رات کو سوتے سے جاگ کر چیخنے لگتا ہے، "مجھے بچاؤ، مجھے بچاؤ"

میں :۔ "خیر وہ زمانہ اب گزر گیا"۔

لڑکی :۔ (آہ بھر کر) "ہاں لیکن اس بچے کو روشنی نہیں ملے گی، نہ ہی میرا شوہر مجھے ملے گا"

میں :۔ "تمہارا شوہر"!

لڑکی :۔ ہاں وہ ہمارے گاؤں کے اسکول میں بچوں کو پڑھاتا تھا۔ اب اس کی جگہ میں پڑھاتی ہوں۔ ہم دونوں ایک دوسرے کو چاہتے تھے، لیکن یہ فساد سے پہلے کی بات ہے۔ وہ مجھے چھپ چھپ کے پڑھایا کرتا تھا، اور میرے ماں باپ میری شادی نمبردار کے لڑکے سے کرنا چاہتے تھے اور میں چھپ چھپ کے پڑھتی تھی اور نمبردار کے بیٹے پر سو لعنت بھیجتی تھی پھر میری شادی کی بات پکی ہو گئی اور پھر دنگے فساد کی خبریں آنے لگیں اور پھر جب میری شادی میں چند دن رہ گئے تو یہ اندھا لڑکا گھومتا گھومتا بھیک مانگتا واپس گاؤں میں آ نکلا۔ اسکو اس حالت میں دیکھ کر گاؤں والوں کے غصے کی کوئی حد نہ رہی۔

(مجمع کا شور)

(ڈھول پیٹتے جارہے ہیں، لوگ ہنس رہے ہیں، چیخ رہے ہیں، اس بے ہنگم شور میں ذیل کی آوازیں اُبھرتی ہیں)

۱ : "مارو، مارو! ان سب کو مار دو کہ کبھی بچنے نہ پائے"۔

۲ : "ایک آنکھ کے بدلے دونوں آنکھیں نکال دو"۔

۳ : "بنیئے کا گھر جلا دو"۔

۴ : "لالے اور اس کی بیٹی کو زندہ زمین میں گاڑ دو"۔

۵ : "چلو جوانو! مارو، مارو، مارو"!

۶ : "ہم خون کا بدلہ چکائیں گے! اپنے دشمنوں کا خون بہائیں گے"!

لڑکی۔ آن کی آن میں سارا گاؤں اکٹھا ہوگیا۔ دوسرے فرقوں کے لوگوں نے گھبرا کر گھر چھوڑ دیئے اور بھاگ کر اسکول کی چہار دیواری میں پناہ لی۔ گاؤں میں سکول کے گرد گھیرا ڈال لیا۔ اندر اسکول میں اُستاد پڑھا رہا تھا۔

اسکول ماسٹر : "پڑھو بچو! سب انسان بھائی بھائی ہیں"۔

باہر سے آوازیں : "مارو، مارو۔ سب کو مار دو"!

اندر کی آوازیں : ہمیں بچاؤ کسی طرح سے ہمیں بچاؤ۔

ہم نے کوئی گناہ نہیں کیا ہے۔ ہم تو سینکڑوں سالوں سے یہاں رہتے چلے آئے ہیں۔

اُستاد جی! آپ نے کبھی دیکھا ہم نے گاؤں والوں کے خلاف کوئی بات کی ہو۔

یہ لیجئے زیور، میری بیٹی کی عزت بچا لیجئے۔

باہر سے آوازیں :۔ زندہ گاڑ دیں گے۔ جہتروں سے ہلاک کر دیں گے۔ تیل میں تل دیں گے
اندر کی آوازیں :۔ ہم نے کچھ نہیں کہا ہے۔ یہاں سے چار سو میل دور بین لوگوں
نے تمہارے گاؤں والوں کی جانیں لی ہیں تم اس کا بدلہ ان سے لو۔ ہم
سے کیوں لیتے ہو؟"

ایک لڑکی :۔"بھائی میں تو گاؤں کی کنواری ہوں میں تمہاری عزت ہوں مجھے بچاؤ
بھائی"۔

ایک لڑکا :۔ اُستاد جی! ہم کیا پڑھیں، سب انسان بھائی بھائی ہیں۔؟

اُستاد :۔ "چپ رہو" میں باہر جاتا ہوں"۔

(قدموں کی آواز، باہر کا شور ایک دم بڑھ جاتا ہے، ارد، ارد، ٹکڑے ٹکڑے کر دو
قیمہ بنا دو، نکالو سب کو باہر، ایک کو زندہ نہیں چھوڑیں گے۔

اُستاد :۔ گاؤں والو! میری سنو۔

(سب چپ ہو جاتے ہیں پھر ایک دم چلاتے لگتے ہیں)

" نہیں۔ ہم نہیں سنیں گے، ہم کسی کی نہیں سنیں گے۔ لہو چاہیے۔ لہو، خون

اُستاد :۔ تمہیں خون چاہیے، میرا خون لے لو۔ لیکن یہ کہاں کا انصاف ہے کہ تم
باہر کے فسادیوں کا بدلہ اپنے گاؤں والوں سے لو۔

ایک آواز :۔ یہ اندھا رکا دکھتے ہو۔ اُن لوگوں نے اس کے ماں باپ کو مار
دیا۔ اس کی آنکھیں نکال دیں۔ ہم بھی اب یہی سلوک کریں گے"۔

دوسرا :۔ "آگے ہٹ جاؤ اُستاد جی"۔

تیسرا :۔ "میں تم سے کہتا ہوں دروازے سے پرے ہٹ جائیے"۔

اُستاد: میں پیچھے نہیں ہٹوں گا۔ مجھے پہلی جماعت کے قاعدے کی حفاظت کرنی ہے جس میں لکھا ہے سب انسان بھائی ہیں۔ اور مجھے میری پیاری اماں جان کی عزت بچانی ہے۔ میں نے دس برس اس قاعدے کو پڑھایا ہے آئیے یہ قاعدہ تم میرے ہاتھ سے چھین رہے ہو؟ میں یہ قاعدہ نہیں دوں گا۔ اپنے جیتے جی میں اس کے ایک ایک حرف کی حفاظت کروں گا۔ گاؤں والو! اس قاعدے کو نہ پھاڑو، یہ تمہارے بچوں کا قاعدہ ہے۔ (اس میں سیب کے پھول ہیں اور ناشپاتی کے درخت ہیں اور بھائی بہن مدرسے جا رہے ہیں۔ اور سورج نکل رہا ہے اور کسان کھیتوں میں ہل چلا رہا ہے۔ اس میں بچے ماں باپ کا ادب کرتے ہیں اور سلیم موہن کا دوست ہے اور رضیہ نرملا کی سہیلی ہے۔ گاؤں والو یہ تمہارے بچوں کا قاعدہ ہے اسے قتل نہ کرو، نئی زندگی کو اُبھرنے دو۔"

ایک آواز: کیا بکتا ہے یہ۔ پہلے اسی پر ہاتھ صاف کرو، دشمنوں سے مِل گیا ہے یہ۔"

دوسری تیسری آوازیں: ہاں ہاں مار ڈالو اُسے، آگے بڑھو جی، دیر ہو رہی ہے۔"

اُستاد: تمہیں بدلہ چاہیئے! دو آنکھوں کے بدلے میری دو آنکھیں لے لو۔"

چوتھی پانچویں آوازیں: دیکھتے کیا ہو جی آگے بڑھ جاؤ، یہ ماسٹر خود بخود پیچھے ہٹ جائے گا۔"

آوازیں: "چلو آگے بڑھو، ہلا، ہلا۔۔۔!"

(شور کم ہو جاتا ہے لڑکی کی آواز اُبھر آتی ہے)

زینب :۔ گاؤں والوں نے اسے مار ڈالا۔ اسکول کی چوکھٹ پر اسکول ماسٹر کا خون بہا۔ اس کے سرخ سرخ تازہ لہو کو دیکھ کر گاؤں والے اِک دم چونک گئے ان کا سارا غصّہ اس کے مقدس لہو میں ڈوب گیا اور وہ۔ پریشان ہو کر پیچھے ہٹ گئے اور اپنے کیے پر پشیمان ہو گئے اپنے اپنے گھروں کو چلے گئے اور پھر اس دن کے بعد انہوں نے دوسرے فرقے والوں کو کچھ نہیں کہا۔ ہمارے گاؤں میں اب سب امن چین سے رہتے ہیں۔ اور کوئی کسی سے باز پرس نہیں کرتا اور اب کہیں کوئی جھگڑا نہیں ہے"۔

میں :۔ "اب شاید تمہارا بیاہ بھی نمبردار کے بیٹے سے ہو گیا ہو گا"۔

زینب :۔ کیسی باتیں کرتے ہو۔ میرا شوہر زندہ ہے لوگوں کے لیے وہ مر چکا ہے اور انہوں نے اسکول ماسٹر کی لاش کو قبر میں گاڑ دیا ہے مگر میرے لیے وہ زندہ ہے اور اس جیتے جی میں نمبردار کے بیٹے سے کیسے شادی کر سکتی ہوں"۔ اب میں ہر روز اسکول میں پڑھاتی ہوں اور ہر روز اردو کے قاعدے میں اس کا مسکراتا چہرہ ۔۔۔ نظر آتا ہے اور پھر میں مسکرا کر اسکول کے بچوں کی طرف دیکھتی ہوں، تو وہ سب مجھے اپنے ہی بچے معلوم ہوتے ہیں، میں، میرا شوہر، میرے بچے، اندھے لڑکے کی گائے۔ میرا دیس کتنا خوب صورت ہے۔ اجنبی! ۔۔۔۔

۔۔۔۔ تم کس دیس کے رہنے والے ہو اجنبی؟"

میں :۔ "میرا کوئی دیس نہیں ہے۔ میں انسانوں کی سڑک پر رہتا ہوں، چلتا ہوں اور کبھی کبھی رک کر کسی چشمے کی سطح سے ہونٹ ملا کے پیاس بجھا لیتا ہوں اب

تم اپنی گائے کو پرے ہٹالو۔ یہ پانی پی چکی ہے اور میری کورٹ کی آسٹین
چارہی ہے۔"

(ہنستی ہے اس کی گم ہوتی ہوئی ہنسی میں میوزک اُبھر آتا ہے۔ چند لمحوں
کے بیک گراؤنڈ میوزک (نشاطیہ) کے سُر اونچے ہوتے جاتے ہیں۔ پھر
تھرتھرا کر گم ہوجاتے ہیں۔)

میں پھر سڑک کے کنارے کنارے چل رہا ہوں۔ یہ سڑک جو مٹن سے ہٹا کام
کو جاتی ہے مٹن ہندوؤں کا تیرتھ ہے۔ یہاں دُور دُور سے جاتری آتے ہیں
اور مٹن کے مندروں اور چشموں کے درشن کر کے امرناتھ کی طرف چلے جاتے ہیں
مٹن براہمنوں کی بستی ہے اور یہاں ہزاروں برس سے برہمن رہتے بستے آئے
ہیں اور سب خوف و خطر پوجا پاٹ میں مصروف نظر آتے ہیں۔

مٹن میں کوئی مسجد نہیں ہے حالانکہ آس پاس کے دیہات میں مسلمان آبادی
کی کثرت ہے۔ میرا مطلب ہے کہ پہلے مٹن میں کوئی مسجد نہیں تھی۔ اب کے جو کئی سالوں
کے بعد میں آیا ہوں تو کیا دیکھتا ہوں کہ یہاں پہ ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے۔ میں
اس مسجد کو دیکھ کر بہت خوش ہوا اور دوڑا دوڑا ملاجی کے پاس گیا۔ ملاجی کا ہاتھ
کٹا ہوا تھا اور ان کی آنکھیں بڑی بڑی اور چمکیلی تھیں۔

مَیں: "ملاجی! یہ مسجد کب بنی؟"

مُلا: "فساد کے دنوں میں۔"

مَیں: "فساد کے دنوں میں؟ حیرت ہے۔ فساد کے دنوں میں تو مسجدیں اور مندر
ٹوٹتے تھے ہیں بنتے ہیں۔ آپ کیسی عجیب بات کرتے ہیں۔"

مُلّا :۔ "ہمارا ملک کشمیر بڑا عجیب ملک ہے نا۔ اس لیے یہاں پر بڑی بڑی عجیب باتیں ہوتی ہیں۔"

میں :۔ "پوری بات بتایئے۔"

مُلّا :۔ جب تمہارے یہاں فساد ہو رہا تھا اور خون کی ندیاں بہہ رہی تھیں اور ہندو اور مسلمان ایک دوسرے کے لہو کے پیاسے معلوم ہوتے تھے ان دنوں فسادیوں نے یہاں ہمارے مٹھ میں آکر بھی فساد کرنا چاہا۔ انہوں نے آس پاس کے دیہاتوں میں کسانوں کو بھڑکا دیا کہ وہ مٹھ کے مٹھ پر حملہ کریں اور براہنوں کو تہ تیغ کر کے اور مٹھ کو جلا کر ان مسجدوں کا انتقام لیں جنہیں بے حرمت کیا گیا ہے۔

مَیں :۔ "تو پھر کیا ہوا؟ مندر تو جلے نہیں ویسے ہی موجود ہیں۔"

مُلّا :۔ "تم سنو تو۔ جب فسادی یہ کھچڑی پکا چکے، تو ان میں سے کچھ لوگ میرے پاس فتویٰ حاصل کرنے کیلئے آئے۔ میں نے فتویٰ نہیں دیا۔ میں نے کہا 'یہ ہمارے شعار کے خلاف ہے۔' اس پر وہ لوگ ناامید ہو کر چلے گئے۔"

مَیں :۔ "پھر؟"

مُلّا :۔ "لیکن فسادیوں نے ہمت نہیں ہاری، انہوں نے کسانوں کو ورغلانا شروع کیا۔ اور آخر میں چند لوگوں کو مٹھ پر حملہ کرنے کے لیے تیار بھی کر لیا۔ جب مجھے اطلاع ملی میں یہاں نہیں تھا ایک گاؤں میں گیا ہوا تھا۔ وہاں میں نے بہت سے کسانوں کو مٹھ کی حفاظت کے لیے تیار کر لیا اور ہم لوگ راتوں رات مٹھ کے سامنے پہنچ گئے۔ بے چارے پجاری بہت ڈرے ہوئے تھے دور سے ڈھول تاشوں کی آواز آرہی تھی، فسادی قریب آرہے تھے۔"

(مجمع کی آوازیں، ڈھول پیٹنے کی آوازیں)

آوازیں:-

۱:- "یہاں مٹھ نہیں رہ سکتا۔"

۲:- "شہید مسجدوں کا بدلہ لیا جائے گا۔"

۳:- "جلا دو اسے نہیں۔"

۴:- "پجاریوں کو چشمے میں پھینک دو۔"

۵:- "آگے بڑھو جوانو! لوہے کے جنگلے کو پار کر جاؤ۔ ان چشموں کی ساری مچھلیاں تمہاری ہیں۔"

مُلّا:- "ٹھہرو! تم اس جنگلے سے آگے نہیں جا سکتے۔"

آواز:- "کیوں نہیں جا سکتے؟ ہم سب کچھ پھونک کے رکھ دیں گے۔"

مُلّا:- "یہ شعارِ اسلامی کے خلاف ہے۔"

دوسری آواز:- "مُلّا دشمنوں سے مل گیا ہے۔"

تیسری آواز:- "ان کی طرفداری کر رہا ہے۔"

چوتھی آواز:- "مُلّا جی سامنے سے ہٹ جاؤ۔"

"میرے جیتے جی تم اس مٹھ پر حملہ نہیں کر سکتے تم لوگ جن کے بہکانے میں آکر حملہ کر رہے ہو وہ ہمارے دیس کو برباد کر دیں گے میں تم سے پھر کہتا ہوں۔ میرے جیتے جی یہاں فساد نہیں ہو سکتا۔"

ایک آواز:- "مُلّا جی ٹھیک کہتے ہیں۔"

دوسری آواز:- مُلّا جی خاک ٹھیک کہتے ہیں۔"

تیسری آواز: "یہ لوگ ہمارے بھائی ہیں، ہزاروں برسوں سے یہاں رہتے چلے آ رہے ہیں۔"

چوتھی آواز: "ان ہی کے بھائیوں نے وہاں آگ لگائی ہے ہم یہاں لگائیں گے۔"

پہلی آواز: "نہیں، تم میں ہمت ہے تو وہاں جا کے لڑو یہاں ہمیں کیوں برباد کرتے ہو۔"

دوسری آواز: "آگے سے ہٹ جاؤ۔"

پہلی آواز: "مُلا جی! سنبھلے، سنبھلے!"

(شور بڑھ جاتا ہے پھر آہستہ آہستہ کم ہو جاتا ہے۔ آخر میں مُلا جی کی آواز ابھر آتی ہے)

مُلا جی: اسی دنگے میں میرا ہاتھ کٹ گیا۔ مگر مٹھ بچ گیا کسانوں کو بہت جلد عقل آگئی کہ فسادی اپنا اُلّو سیدھا کر رہے تھے پجاریوں نے بھی میرا بہت شکریہ ادا کیا۔ اس سے پہلے یہاں مٹھ کے قرب و جوار میں کوئی مسجد نہ بن سکتی تھی۔ اب ان پجاریوں نے اور یہاں کے جاتریوں نے خود مسجد کے لیے چندہ جمع کیا اور اس کی تعمیر کے سلسلے میں سب سے پیش پیش رہے۔ یہ مسجد جو آپ تم دیکھ رہے ہو اسی چندے سے بنی ہے۔

میں: "مُلا جی، آپ بہت اونچے آدمی ہیں۔"

مُلا: "میں ایک چھوٹا سا انسان ہوں بیٹا۔ ہاں میری مسجد بہت اونچی ہے۔ آسمان تک جاتی ہے۔"

(خوش آہنگ موسیقی چند لمحوں کے لیے بجتی ہے)

میں سڑک کے کنارے کنارے جا رہا ہوں، یہ وہ میرا جانا پہچانا کشمیر نہیں ہے یہ نیا کشمیر ہے، تہذیب کا، اُستاد جی کا کشمیر، کشمیر کے بیٹے ڈل میں کھلے ہوئے نیلوفر کے پھول میں جو طوفان کی دھمک محسوس کرتے ہوئے چونک اٹھتے ہیں، اور طوفان کی لہروں پر ڈھول رہے ہیں اور سنبھل سنبھل کر گرد و پیش کا جائزہ لے رہے ہیں اور سُرخ پروں والے شکاری تیزی سے پانی کی سطح کو چیرتے ہوئے نشاط باغ کی طرف بڑھ رہے ہیں اور بانجی چپو چلاتے ہوئے گا رہے ہیں

حسن و جمال کا کشمیر۔
دل کش، شوخ و دل پذیر
اپنا وطن ہے بے نظیر!۔
پیارے وطن کے دوستو،
سرکش و کامراں رہو،
باغِ نشاط کے گلو!!!۔
شاد رہو جوان رہو!!۔

اخباری جوتشی

جب سے ہندوستانی راجاؤں کو پنشن ملی ہے، راج جوتشیوں اور ناچنے والیوں کا بھاؤ مندا پڑ گیا ہے۔ لیکن اس سے پہلے ناچنے والیوں اور بالخصوص راج جوتشیوں کی ریاستوں میں بڑی پوچھ گچھ تھی۔ راجا لوگ انہیں سر آنکھوں پر بٹھاتے تھے، اور ریشمی چلمن کی اوٹ سے مہارانیاں انھیں اپنے ہاتھ دکھاتی تھیں۔ وہ نرم و نازک ہاتھ جن کی مخروطی انگلیوں پر نیلم، پکھراج یاقوت اور لعل بدخشاں چمکتے تھے۔ ایک دفعہ بچپن میں میں نے بھی اپنا ہاتھ ایک راج جوتشی کو دکھایا تھا۔ راج جوتشی نے میرا ہاتھ دیکھ کے کہا تھا "یہ بالک بڑا گیانی ہوگا" اور میں نے راج جوتشی کی موٹی توند، اس کی سلکی اچکن اور سونے کے بٹن دیکھ کے سوچا تھا کہ بڑا ہو کے اگر میں گیانی ہوا تو اسی راج جوتشی کی طرح گیان دھیان حاصل کروں گا ورنہ جینے کا کچھ مزا نہیں ہے۔

اب میں ریلوے میں کلرک ہوں اور میرا سارا گیان دھیان اسی میں صرف ہوتا ہے، کہ کس طرح پرانی فائلوں کو چھ ماہ تک دبا کے رکھوں اور نئی فائلوں کو کھولنے سے انکار کر دوں۔ یہ بھی بڑا مشکل کام ہے اور میں اسے کرتا ہی رہتا لیکن اس سال تو مہنگائی نے بالکل کمر توڑ دی۔ چنانچہ میں ریلوے کی کلرکی چھوڑ کے اخبار "دلیش بھگت" اخباری جوتشی کے عہدے پر ملازم ہو گیا۔ آج کل ہر ایسے روزنامے میں ایک جوتشی ہوتا ہے جو ہر سنڈے

کو اخبار میں جوتش سے حساب لگا کے اپنے اخبار کے پڑھنے والوں کی قسمت کا اندازہ لگاتا ہے۔ اس سے پہلے کانگریسی اور سوشلسٹ اخباروں میں جوتشی نہیں ہوا کرتے تھے، لیکن ۱۵ اگست کے بعد ان لوگوں کو بھی جوتشیوں کی ضرورت پڑ گئی۔ اسی سلسلے میں میں نے جب اخبار "دیش بھگت" کا اشتہار دیکھا تو میں نے عرضی داغ دی، جو منظور ہو گئی۔ شامت اعمال سے مجھے جوتش وغیرہ تو نہ آتا تھا، مگر سوچا کہ راج جوتشی نے کہا تھا کہ بیٹا بڑے ہو کے گیانی بنو گے، سو آج موقع ہاتھ آ ہی گیا، لگے ہاتھوں اس کام کو بھی کر ہی ڈالیں اور پھر ریلوے کی کلرکی کی دن بھر کی گھس گھس کے بعد ۸۰ روپئے ملتے ہیں۔ ان سے کیا ہوتا ہے۔ یہاں ہر ماہ ساڑھے تین سو ملیں گے اور کام کچھ بھی نہیں ہے۔ بس ہر ہفتے سات دن کا زائچہ تیار کر کے اخبار میں دے دینا ہے تاکہ پڑھنے والے اسے دیکھ کے آئندہ ہفتے کے لیے اپنی قسمت کا اندازہ لگا سکیں۔ بس یوں سمجھئے کہ ہر مہینے یہ چار زائچے اور ایک مہینے کے بعد پورے مہینے کا زائچہ خاص طور پر ان لوگوں کیلئے جو اس مہینے میں پیدا ہوئے ہوں۔

میں نے پوچھا "اور کوئی کام۔"

چیف اڈیٹر بولے "پہلے ہم یہ دھندا نہیں کرتا تھا۔ صرف دیش کے لڑنے والے سیوکوں کی خبریں چھاپتا تھا۔ اب لڑنے والے نہیں رہے تو ہم لوگ کیا کریں، ادھر "دیش سیوک" نے بڑا بھاری جوتشی رکھا ہے اس سے اخبار کی بکری بہت بڑھ گئی ہے۔ اب آپ کا کام دیکھتے ہیں کہ "دیش بھگت" کے گاہک کتنے بڑھاتا ہے"۔

میں نے کہا "آپ فکر نہ کیجیے، دوسرے ہفتے ہی سے پچاس ہزار کی اشاعت نہ ہو تو میرا نام پنڈت تھکی رام وسوندھا نہیں کچھ اور رکھ دیجیے گا۔"

چیف ایڈیٹر پنسل کے سرے پر لگا ہوا ربڑ چباتے ہوئے بولے "آپ ریس کا جوتش بھی جانتے ہیں؟"

میں نے کیلا اسفنج اٹھا کر اسے کھاتے ہوئے جواب دیا "جی ہاں مہاراجہ بیضاوا مرحوم کو میں ہی ٹپ نکال کے دیا کرتا تھا۔ اس کے علاوہ میں چاندی سونے، لوہے، تیل اور روئی کی جوتش بھی جانتا ہوں۔"

چیف ایڈیٹر نے چیونگم کھاتے ہوئے کہا "جب تو آپ ہمارے کمرشل صفحے کے لیے بھی کارآمد ہو سکتے ہیں۔"

"آپ کی عنایت ہے" میں نے خوش ہو کر سیاہی حلق میں انڈیلی اور ہونٹوں کو سیاہی چوس سے صاف کرتے ہوئے کہا۔

سینیچر کا دن سر پر آ گیا۔ اور ابھی تک میں نے اپنی رپورٹ تیار کر کے پریس میں نہیں دی تھی۔ چیف ایڈیٹر نے دو تین بار یاددہانی کرائی، میں نے کہا آپ اخبار روک کے رکھیے میں نے سخت محنت کر رہا ہوں۔ بس زائچہ تیار ہونے میں تھوڑی سی دیر ہے ابھی سب کچھ ہوا جاتا ہے۔ آپ دیکھیے گا۔ ایسی عمدہ عورت بناؤں گا کہ بڑے بڑے راج جوتشی منہ دیکھتے رہ جائیں گے۔ اس اثنا میں اِدھر اُدھر بہت گھوما اور دو ایک کتابیں بھی پڑھیں جوتش پر لیکن کچھ سمجھ میں نہ آیا آخر جیسے تیسے بھی بن سکا میں نے زائچہ تیار کر کے بھیج دیا اور کمرشل نوٹ بھی لکھا اور ریس کے لیے بھی ٹپ نکال کے بھیج دیا آپ بھی ملاحظہ فرمائیے۔

کمرشل نوٹ

اس ہفتے میں بازار مندا رہے گا۔ تھوڑی سی سرگرانی ہوگی لیکن جلد اتر جائے گی۔ لوہا تانبے سے ٹکرائے گا۔ لیکن پھر الگ ہوجائے گا۔ مونگ کی دال، آلو کی بھاجی اور پاپڑ کا بھاؤ تیز ہوگا۔ لیکن پٹرول کا گیلن آدھا ہو جائے گا، اور پھر ایک دم پھٹ جائے گا۔ جس سے بازار میں آگ لگنے کا اندیشہ ہے۔ بیوپاریوں کو چاہیے کہ اس موقع پر فائر انجن منگوا کر رکھیں۔

ٹاٹا (لمٹیڈ) ڈلمیا لیسکٹ، برلا ہندوستان نمبر ۱۰ اور بھائی ودھارا سنگھ کے آچار شلغم کے حصّے اونچے جائیں گے۔ چاندی سونے کے بھاؤ ملے گی اور سونا گندم کے بھاؤ پر، اور گندم کسی بھاؤ پر بھی دستیاب نہ ہوگی، یہ سارا ہفتہ اسی طرح جائے گا۔ اور ممکن ہے کہ سارا سال اسی طرح جائے لیکن فکر کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ سرکار اپنی ہے، اور ہندوستان کا ستارا اس وقت مشتری کے گھر میں ہے۔ جس کا اختری فیض آبادی سے کوئی تعلق نہیں ہے۔

روئی کا بھاؤ گر جائے گا۔ کپڑا مہنگا ہو جائے گا۔ گنے کا بھاؤ سستا ہو جائے گا لیکن کھانڈ مہنگی ہو جائے گی۔ اس ہفتے جو بیوپاری سفید چیز کا بیوپار کرے گا اسے بڑا فائدہ ہوگا، چاہے وہ سفید لٹھا بلیک مارکیٹ میں فروخت کرے یا بزناؤ کا سفید ہاتھی پالے ہر صورت میں فائدہ ہی فائدہ ہے۔ اس ہفتے کے چھ دنوں میں کارخانوں میں ہڑتال رہے گی، ساتواں دن اتوار کا ہوگا جس روز چھٹی ہوتی

ہے لیکن اس سے گھبرانے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اسٹاک ایکسچینج کے باہر گھومنے والے سانڈوں کی پوجا کرنے سے اور ان کے منہ میں تمباکو والا پان ڈالنے سے یہ سنکٹ جاتا رہے گا۔

ریس کے ٹپ (از) ریس کا رسیا

اس ہفتے کا لکی دن پانچواں ہے اس لیے آنکھ بند کر کے پانچویں ریس کھیلئے اس میں پانچویں نمبر کے گھوڑے پر اپنی ساری جائداد لگا دیجیے۔

تیسری اور آٹھویں ریس بالکل نہ کھیلئے۔ سب گھوڑے اور سب جاکی نکمے ہیں اور گھوڑوں کے مالک ایک دوسرے سے ملے ہوئے ہیں۔ پبلک کو اُلّو بنائیں گے۔ اور لاکھوں روپیہ لوٹ لیں گے۔

چوتھی ریس میں گوالیار اور کشمیر دوڑ رہے ہیں۔ لیکن یہ کامیاب نہیں ہو سکتے جیت سیٹھ بھوندو لال کے گھوڑے "ٹامی" کی ہوگی اور اگر ٹامی نہ جیتا تو "ہرامی" تو ضرور جیتے گا۔

پہلی اور دوسری ریس کے گھوڑے اچھے ہیں۔ کوئی کسی دوسرے کو ہرا نہیں سکتا۔ آپ کوئی سا گھوڑا کھیل دیجیے جیت جائے گا۔ اور اگر نہ جیتے تو ایک ریوالور اپنے پاس رکھیے۔ پہلی فرصت میں لبلبی دبا کر خودکشی کیجیے۔

چھٹی ریس میں "ہندوستان" اور "پاکستان" بہت اچھے گھوڑے ہیں بہتر یہ ہوگا کہ ہندو "ہندوستان" کھیلیں اور مسلمان "پاکستان" لیکن یہ دونوں گھوڑے

آنے والے نہیں ہیں۔ اس ریس میں ساتویں نمبر کا جو گھوڑا دوڑ رہا ہے۔ اس کا نام ہے مادنٹ بیٹن۔ بس یہی گھوڑا آخر میں جیتے گا۔ اس جیت سے پہلے ریس کورس میں ہندو مسلم فساد بھی ہو سکتا ہے۔

ساتویں ریس میں ۹ نمبر کا گھوڑا سب سے اچھا ہے۔ لیکن ۳ نمبر بھی بُرا نہیں آخری فرلانگ تک یہ دونوں گھوڑے برابر چلے آئیں گے لیکن آخر میں وہی گھوڑا جیتے گا جس کے مالک نے اسے زیادہ شراب پلائی ہوگی کس گھوڑے نے زیادہ شراب پی ہے۔ اس کا اندازہ اصطبل کے لوگوں ہی سے ہو سکتا ہے۔ جوتشی آپکو اس بارے میں کیا بتا سکتا ہے؟

نویں ریس میں سب گھوڑیاں دوڑ رہی ہیں۔ ان کے نام فلم اسٹاروں سے ملتے ہیں۔ نرگس، ثریا، نورجہاں، حفیظ جہاں، حسن بانو اور بدھوا ایڈوانی حالانکہ موخر الذکر ایک ایکٹر کا نام ہے۔ لیکن گھوڑے کے مالک نے اسے بھی شاید کسی ہیروئن کا نام سمجھ کر اپنی گھوڑی کا نام رکھ دیا۔ خیر اس سے ہماری جوتش میں کچھ فرق نہیں پڑتا۔

اس ریس میں چندر لیکھا گھوڑی جیتے گی کیونکہ یہ ابھی ابھی سرکس سے آئی ہے۔"

اس ہفتے آپ کی کنڈلی کیا کہتی ہے۔

سوموار:- آپ دیر سے بستر سے اٹھیں گے۔ سر میں ہلکا ہلکا درد بھی محسوس ہوگا۔

جو اسپیرو دکھانے سے جاتا رہے گا۔ دن اچھا گذرے گا۔ دفتر میں ہیڈ کلرک سے لڑائی ہوگی لیکن فرم کا مالک آپ کی طرفداری کرے گا۔ شام کے چھ بجے آپ ضرور کوئی خوشخبری سنیں گے۔

منگوار:۔ کوئی گم شدہ خزانہ ملے گا۔ بیوی سے لڑائی ہوگی۔ میٹنی شو میں آپ ایک خوبصورت لڑکی دیکھیں گے جس کے ساتھ اس کا خاوند ہوگا اور آپ اس سے کوئی بات نہیں کر سکیں گے۔ اور کلیجہ پکڑ کے رہ جائیں گے۔ رات کو گھر لوٹتے ہوئے ٹرام کا کنڈکٹر آپ کی بے عزتی کرے گا۔ صبح چائے کے ساتھ آلو کی بھجیا ملے گی۔ رات کو فاقہ ہوگا، مگر بیچ میں دن کا وقت بڑے مزے میں بسر ہوگا۔

بدھوار:۔ آپکا چیک Dishonour ہوگا۔ پولیس حراست میں رکھے گی۔ شام کو آپ کی بیوی کا بھائی ضمانت دے کے چھڑا کے لائے گا۔ یہ بہت برا دن ہے۔ آپ کے لیے لیکن رات بہت اچھی گذرے گی۔ گھر میں کھانا بھی اچھا ملے گا۔ سر میں تیل کی مالش بھی ہوگی۔ اس روز اگر آپ گھر سے باہر نہ نکلیں تو اچھا ہے ورنہ آپکی مرضی۔

جمعرات:۔ راج دربار میں عزت ہوگی۔ کوئی نیا محبوب ملے گا۔ دوپہر کے وقت آپ بازار میں تاش لینے کے لیے جائیں گے۔ اور پھر کسی موٹر کے نیچے آکر مر جائیں گے۔

جمعہ:۔ جمعرات کو اگر آپ نہیں مرے تو جمعہ کی صبح کو ناشتے پر آپ تیتر کے کباب کھائیں گے۔ اور اگر آپ سبزی خور ہیں تو مونگ کی دال کے کوفتے۔ اخبار میں آپ ضرور کوئی خبر پڑھیں گے جسے پڑھ کر آپ کو بڑا صدمہ ہوگا جو ایک بیگ

براندی سے دور ہو جائے گا۔ اس روز آپ کے چھوٹے بچے کی ٹانگ ٹوٹ جائیگی ورنہ دن بھر اچھا گذرے گا۔ آپ کی بیوی ایک نئی ساڑھی کا تقاضہ کرے گی۔

سینچر :- آپ صبح راشن لینے جائیں گے۔ لیکن دوکان بند ملے گی۔ کپڑے کے کوپن لینے جائیں گے۔ لیکن دفتر بند ہوگا۔ ریس کھیلنے جائیں گے۔ اور بہت سا روپیہ ہار کے آئیں گے۔ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ خرید کر فرسٹ میں بیٹھیں گے۔ اور ٹکٹ چیکر آپ کا چالان کر دیگا۔ لیکن آپ پیسے ادا کر کے چھوٹ جائیں گے۔ اس روز ہمسایوں سے لڑائی کا خطرہ ہے۔ لیکن ہاتھ جوڑ دینے سے یہ خطرہ جاتا رہے گا۔ بزنس میں ترقی۔ دل کھول کے سٹہ کھیلئے اور بلیک مارکیٹ کیجیے بہتر دن بلیک مارکیٹ کے لیے بہت اچھا ہے۔

اتوار :- آپ کو اچانک دفتر میں بُلا لیا جائیگا اور آپ کی چھٹی کے سارے پروگرام ختم ہو جائیں گے۔ آپ دفتر میں سڑیں گے اور گھر پر بیوی بچے آپکو گالیاں دے رہے ہوں گے۔ شام کو آپ گھر جاتے ہوئے بچوں کے لیے دو کیلے، دو امرود اور ایک سنگترہ ضرور خریدیں گے۔ اور کوئی منچلا آپ کی جیب کترے گا۔

لیکن جو لوگ اتوار کے روز پیدا ہوئے ہوں اُن کے لیے یہ دن بہت اچھا ہے وہ سو سال تک جئیں گے جس میں پہلے پچاس برس گھر میں اور دفتر میں بسر ہوں گے اور اگلے پچاس برس پاگل خانے میں ....!

دیش بھگت کا پرچہ جب اتوار کے روز بازار میں آیا تو دس منٹ میں سب بک گیا۔ ایک کاپی بھی نہ رہی۔ دوسرے دن اخبار کے دفتر کے باہر اخبار پڑھنے

والوں کا جمِ غفیر جمع تھا۔ وہ لوگ دفتر کو آگ لگانے کی کوشش کر رہے تھے۔ لیکن پولیس کی مدد سے حالات پر قابو پا لیا گیا۔ چیف ایڈیٹر اور دوسرے مدیروں نے مل کر میری ٹھکائی کی۔ چنانچہ یہ مضمون میں آپ کو ہسپتال سے لکھ کر روانہ کر رہا ہوں۔ آپ سمجھتے ہوں گے کہ میرا جوتش غلط نکلا اس لیے میرا یہ حال ہوا، نہیں صاحب یہ بات نہیں ہے۔ میرا جوتش سو فیصدی سچ نکلا۔ اتنا سچ کہ لوگ اسے برداشت نہ کر سکے۔ لوگ اخباری جوتشی کے پاس سچائی ڈھونڈنے نہیں جاتے۔ اپنے جھوٹے خواب دیکھنے جاتے ہیں۔ یہ میری ہی غلطی تھی ۔:۔

صاحب

"صاحب! یہ میں کیا سنتا ہوں کہ اس ملک میں کھانے کی کمی ہے لوگوں کو خوراک نہیں ملتی. یہ جھوٹ ہے. افترا ہے. بہتان ہے اور کسی کمیونسٹ کا گڑھا ہوا ہے ورنہ صاحب دراصل اس ملک میں کھانے کی کوئی کمی نہیں ہے، یہاں ہر قسم کی خوراک ملتی ہے. اب مجھی کو دیکھئے میں مرغ، بٹیر، تیتر، پلاؤ، قورمہ کباب ہر چیز کھاتا ہوں، ہر روز کھاتا ہوں اور بڑے مزے سے کھاتا ہوں. صبح و شام میرے دسترخوان پر انواع و اقسام کی سبزیاں ترکاریاں چنی ہوتی ہیں اور ابھی پرسوں کی بات ہے میں وزیر غذا کے یہاں مدعو تھا. وہاں پر کم سے کم دس قسم کے کھانے میز پر سجے ہوئے تھے اور ہر قسم کے پھل موجود تھے، اتنے بڑے بڑے سنہری سنگترے میں نے کہیں نہیں دیکھے. ہمارے ناگپور کے سنگترے تو ان کے سامنے بالکل حبشی معلوم ہوتے تھے، وزیر غذا سے پوچھنے پر پتہ چلا کہ یہ سنگترے خاص طور پر کیلیفورنیا امریکہ سے منگائے گئے ہیں اور ان کی قیمت فی سنگترہ تین مارشل ڈالر ہے کیلیفورنیا کی دو چیزیں بہت مشہور رہیں. ایک تو سنگترے دوسری ہالی وڈ کی ایکٹریسیں. ابھی تو صرف سنگترے آتے ہیں لیکن جب مارشل پلان ہندوستان میں نافذ ہوگا. تو ہالی وڈ کی ایکٹریسیں بھی آئیں گی اور ملک کی صنعت و حرفت کو بہت فروغ حاصل ہوگا.

" خیر! بات غذا کی ہو رہی تھی میں کہاں سے کہاں پہونچ گیا. اُس دن کا ذکر

ہے۔ میں گورنمنٹ ہاؤس میں مدعو تھا وہاں پر بھی میں نے کھانے پینے کی کمی نہیں دیکھی کئی دفعہ اپنے دوست رکن پور والے کے یہاں جلسں ہوئی سبھی لوگ کھاتے پیتے خوش و خرم نظر آئے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اخباروں میں ہر روز یہ خبر کیسے نظر آتی ہے کہ ملک میں غذائی بحران ہے صاحب! میں سچ عرض کرتا ہوں ملک میں غذائی بحران کہیں نہیں ہے اور اگر کہیں ہے تو کمیونسٹوں کا پیدا کیا ہوا ہے آپ ان کو گولی مار دیجئے غذائی بحران خود بخود جاتا رہے گا یہ کمیونسٹ بڑے بدمعاش ہوتے ہیں صاحب۔ میں آپ کو اپنی مثال بتاتا ہوں ایک دفعہ اتفاق ایسا ہوا کہ میں نے اپنے ڈرائیور کو تین مہینے تک تنخواہ نہیں دی محض اتفاق ہو گیا، ورنہ میں اپنے ملازموں کا خود بہت خیال رکھتا ہوں، تو صاحب! وہ بہت چیں پیڑ کرنے لگا، میں نے جب اسے اچھی طرح ڈانٹا تو وہ دوسرے روز لال باوٹے والوں کو اپنے ساتھ لے آیا۔ اور آس پاس کی کوٹھیوں میں شور مچا گیا کہ بیبلی کوٹھی والے صاحب نے تین مہینے کی تنخواہ اپنے ڈرائیور کی مار لی ہے۔ صاحب! ان لال باوٹے والوں نے اس ڈرائیور کو تین مہینے کی تنخواہ دلوائی اور ایک ماہ کا بونس الگ دلوا یا۔ ایسی اندھی کھوپڑی کے لوگ ہیں یہ ان کو جاری سرکار جتنی جلدی ترمڑی پار کرو سے اچھا ہے، ہم نے سوراج اس لیے نہیں لیا تھا کہ ڈرائیوروں کو بونس دیتے پھریں اور مزدوروں کو مہنگائی الاؤنس دیں۔ ایسے ہم ان غریب آدمیوں کو منہ لگانے لگیں تو حکومت ہو چکی۔

"ہاں بھئی دوسرا پیگ بنا دو، مگر ذرا بڑا بنانا۔ جانے کیوں آج بلیڈی میں مزا نہیں آرہا ہے۔ اور یہ مکھن میں تلے ہوئے سبز مٹر اور آلو کے قتلے بھی کیسوں

داکھ کے بنے ہوئے معلوم ہوتے ہیں۔ ہوٹل والوں نے اپنا خانساماں بدل دیا ہے شاید! کیوں میاں وہ پرانا خانساماں کہاں چلا گیا؟ ساٹھ روپے تنخواہ مانگتا تھا؟ باپ رے! ارے میاں یہ لوگ تو ساٹھ کیا سَتّر میں بھی خوش نہیں ہوں گے آج کل تو زمانے کی ہوا ہی ایسی ہے۔ جسے دیکھو سر پر چڑھا آ رہا ہے کہتا ہے مہنگائی الاؤنس دو، گنہ دسبر کی اُجرت دو، ارے بھئی اب ساٹھ مانگتے ہو۔ پہلے کیسے سات میں گزر کرتے تھے، میں کہتا ہوں آگ لگ رہی ہے زمانے کو۔ چین میں دیکھو کیا ہو رہا ہے، ملایا میں کیا ہو رہا ہے۔ برما میں کیا ہو رہا ہے؟ یہ ہماری حکومت کیوں سوئی پڑی ہے، چین میں فوجیں کیوں نہیں بھیجتی! کیا ہوا ہے اس کو؟ ارے بھئی میں نے تو اپنی بیوی کے جواہرات سوئٹزرلینڈ بھیج دیئے ہیں، تم نے کہاں بھیجے ہیں؟ جنوبی امریکہ! ہاں بھئی! ہاں بھئی میں نے بھی سنا ہے کہ برازیل آج کل بہت ہی محفوظ جگہ ہے، وہاں آج کل کوئی کیمونسٹ دم نہیں مار سکتا۔ مگر یار ادھر آؤ۔ قریب آؤ، ایک بات کان میں کہتا ہوں۔ تم نے کہاں بھیجے ہیں؟ جنوبی امریکہ ہاں بھئی میں نے سنا ہے کہ برازیل آج کل بہت ہی محفوظ جگہ ہے، وہاں آجکل کوئی کیمونسٹ دم نہیں مار سکتا، مگر یار ادھر آؤ قریب آؤ، ایک بات کان میں کہتا ہوں کوئی بھروسہ نہیں ہے ان لوگوں کا کیا معلوم کسی روز وہاں بھی اٹھ کھڑے ہوں ڈرائیور لوگ وہاں بھی تو ہوتے ہوں گے، ہاں مزدور بھی ہوں گے۔ بس یہ لوگ پھر وہاں بھی پہونچ جائیں گے۔

• ہاں بھئی میں غذا کی بات کر رہا تھا۔ ہندوستان میں غذا کی کہاں کمی ہے، ارے میاں یہ تو سونے کی چڑیا ہے سونے کی چڑیا۔ یہاں کی تو مٹی بھی سونا اُگلتی

ہے۔ ایک روز ہمارے بھنگی کو کوڑے کے ڈھیر میں سے سونے کا آویزہ ملا،
ایک روز میں نے دیکھا کہ بھنگی کی بیوی نے میری بیوی کا آویزہ پہن رکھا ہے،
ہمارے بھنگی کی بیوی بڑی خوبصورت ہے، دیکھو تو لٹو ہو جاؤ۔ ایک روز آؤ نا!
تمہیں درشن کرائیں گے۔ ہی، ہی، ہی، ہی ۔۔۔۔ میں نے اس سے پوچھا۔
"تو نے یہ آویزہ کہاں سے لیا؟" بولی "میرے خاوند نے دیا ہے"۔ میں نے بھنگی
سے پوچھا وہ بولا "مجھے کوڑے میں ملا تھا" لو۔ یہ ہے ہندوستان کی مٹی۔ میں
تمہیں اپنی مثال بتاتا ہوں، ایک دفعہ میں جب بہت چھوٹا تھا، میں نے بھنگی کے بیٹے
یعنی یہ جو اب ہمارا بھنگی ہے اس کے ساتھ کھیلتے ہوئے کوڑے کے ڈھیر کو ٹٹولنا
شروع کیا تو اس میں سے ہمیں چار آنے کے پیسے ملے۔ دو سنگترے، ایک امرود اور
ایک کتاب کا ورق جس کا نام تھا "آرائشِ حسن" اور ایک زنانہ سلیپر کا جوڑا جس سے
بعد میں اماں نے مجھے پیٹا۔ ایک کیک کا ٹکڑا جس کے ساتھ مکھن لگا ہوا تھا۔ بہت
سارا پلاؤ اور گوشت اور چار چھ روٹیاں اب یہ تو ایک کوٹھی کے کوڑے کرکٹ کے
ڈھیر کا حال ہے۔ اب ذرا گن جاؤ آس پاس کی سینکڑوں کوٹھیاں۔ یہ غریب لوگ
جوان ڈھیروں کو ٹٹولتے ہیں، مزہ اڑاتے ہیں مزہ۔ کلکتے بمبئی اور دوسرے بڑے
بڑے شہروں میں ایسے لاکھوں کروڑوں ڈھیر لگے ہوتے ہیں۔ اور آدمی ان سے
فائدہ اٹھاتے ہیں اور ہمیں تمہیں اس سے کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ حالانکہ ہمارے
ہی گھروں سے سب چیزیں جاتی ہیں۔ میں تو کہتا ہوں کہ سرکار ہماری اِن کوڑا کرکٹ
چننے والوں پر ٹیکس لگا دے تو کیسا رہے؟ لاؤ ہاتھ میرے یار کیسی بات کہی
ہے، اس بات پر سرکار کو ہمیں وزیر بنا دینا چاہیے کروڑوں روپے کی آمدنی

کروڑوں اسی ایک ٹیکس سے۔ میں تم سے سچ کہتا ہوں۔ یہ لوگ دراصل کوڑے کرکٹ کے ڈھیر سے خوراک نہیں ڈھونڈھتے۔ یہ اور دوسری چیزیں ڈھونڈھتے ہیں۔ یہ سب کمیونسٹوں کی چالبازی ہے میں سب جانتا ہوں ان سب لوگوں پر ٹیکس لگادینا چاہیے۔ کیا خیال ہے میں حکومت کو خط لکھوں؟

یہ خوراک پیدا کرنے کا سوال بھی حکومت کو یوں ہی پریشان کر رہا ہے ورنہ ہندوستان میں کیا نہیں ہوتا، گیہوں ہوتا ہے باجرہ ہوتا ہے، مکئی ہوتی ہے، گنا ہوتا ہے، روئی ہوتی ہے، پٹ سن ہوتا ہے، گلاب کا پھول ہوتا ہے۔

اور مرغ کی ٹانگ ہوتی ہے جس کا جواب دنیا میں کہیں نہیں ہے

کیوں! سچ کہنا، مرغ کی ٹانگ کا جواب دنیا میں ہے؟ سچ کہنا دوست کیا مزہ کی بات کہی ہے! اور یہ لوگ غذا اگانے کا رونا رو رہے ہیں۔ ارے بھئی میں تمہیں اپنی مثال بتاتا ہوں۔ میرے پاس چار درجن سے زیادہ فلٹ کی ٹوپیاں ہوں گی، اور ایک ٹوپی کی باری دوسرے تیسرے مہینے کہیں جاکے آتی ہے اب تک روز میں سرمئی رنگ کی امریکن ٹوپی پہننے لگا، کیونکہ میں اس کے ساتھ امریکن سوٹ پہن رہا تھا۔ کہ میں کیا دیکھتا ہوں ٹوپی کے اوپر ایک خوبصورت پیلا پھول اگا ہوا ہے! ہیں! یہ کیسے ہوا؟ دیکھا تو ٹوپی کے اوپر ایک ذرا سا مٹی کا ٹکڑا پڑا ہوا ہے۔ کہیں رستے میں گر گیا ہوگا، کہیں سے اسے مٹی بھی مل گئی ہوگی۔ اب یہ اس ذرا سی مٹی سے پھول اگ آیا۔ تو جناب یہ ہے ہندوستان کی مٹی! میں سوچتا ہوں کہ اگر ہر ہندوستانی اپنی ٹوپی پر خوراک اگانا شروع کر دے تو کیسا رہے! ٹوپی کی بالائی سطح ۵۲ مربع انچ ہے اور ہندوستان میں تیس پینتیس کروڑ آدمی تو ہونے ہی ہوں گے۔ اب حساب لگالو تم ہی کہتا ہوں۔

اگر ہندوستان کے سارے آدمی صرف اپنی ٹوپیوں پر فصل اگانا شروع کر دیں تو کبھی قحط نہیں پڑ سکتا. کیا کہتے ہو. ننگے سر والے لوگ کیا کریں؟ ارے بھی ان کے سروں پر بھی قانوناً ٹوپیاں بلکہ چھوٹی چھوٹی مٹی کی ٹوکریاں رکھ دی جائیں اور اس کام کے لیے گاندھی ٹوپی تو بہت موزوں رہے گی. کیا خیال ہے؟ میرے خیال میں یہ ہندوستان کا سب سے بڑا پروجیکٹ بن سکتا ہے. ٹوپی پروجیکٹ! میرے خیال میں اسے کامیاب بنانے کے لیے امریکہ سے ماہر سائنسداں، ماہر انجینئر اور ماہر بنیکروں کی مدد مانگی جائے. اور اس کام کی ابتدا ہمی کینبٹ کے اراکین سے ہوتا کہ کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہو کہ یہ جو اپنے سر پہ دھان کی فصل اگائے چلے آ رہے ہیں یہ جے رام داس دولت رام ہیں اور یہ جن کے سر پر گندم کے خوشے لہرا رہے ہیں، یہ جان متھائی ہیں، اور یہ جن کے سر کے اوپر مونگ کی دال اگی ہوئی ہے یہ سردار پٹیل ہیں یہ تھومر کا کھیت پنڈت نہرو کا ہے اور جن کے سر کے اوپر گوبھی کے پھول اُگے ہوئے ہیں، وہ مولانا ابوالکلام آزاد ہیں! ہاہاہا! کیا لطف رہے کیا دماغ کام کر رہا ہے میرا اس وقت، ذرا اکیے - [illegible] ہی پیگ دینا اصلی فرینچ برانڈی پی کے جی سے کام کرتا ہے. جانے [illegible] کے بعد کیا ہوگا خیر یار تو جب بھی پئیں گے. یہاں نہیں پئیں گے تو گوآ جا کے پئیں گے. میں نے تو اپنا بنیک اکاونٹ بھی گوآ بھیج دیا ہے جانے یہاں کل کلاں کو کیا ہو جائے. کون کسی کا اعتبار کرے. آں. تم بھی ایسا کرو میرے یار بس دو چار لاکھ یہاں رہنے دو باقی باہر بھیج دو۔

"اچھا بھیا ایک بات اور سنو۔ اپنے یہاں جو کہتے ہیں کہ غذا کا قحط ہے تو یہ لوگ

کتے، چوہے، بلیاں کیوں نہیں کھاتے؟ ارے بھئی دوسرے کئی مشرقی ملکوں میں تو لوگ انہیں بڑی رغبت سے کھاتے ہیں۔ کتے بلیاں تو کیا وہ لوگ تو سانپوں تک کو ابال کے کھا جاتے ہیں۔ یہاں کیوں نہیں کھاتے یہ لوگ؟ یہاں تو کتے بلیاں چوہے اتنی تعداد میں ہیں کہ کیا بتاؤں خود میری کوٹھی میں اتنی تعداد میں ہیں کہ اِن سے ایک اچھا خاصا چینی ریستوران کھل سکتا ہے۔ مگر کسی میں اتنی عقل ہی نہیں کہ ان غریب آدمیوں سے یہ چیزیں کھانے کو کہے۔ خوامخواہ ہر ہفتے راشن میں گیہوں اور باجرہ اور چاول دے کر ان لوگوں کا دماغ خراب کر رہے ہیں۔ میں تو سمجھتا ہوں، راشن ایک سرے سے بند کر دینا چاہیے۔ جب یہ لوگ کہیں سیدھے ہوں گے۔ ارے میں تمہیں اپنی مثال بتاتا ہوں۔ میں جب پیرس میں تھا تو مجھے ایک کنیڈین کمانڈر نے بتایا کہ ایک دفعہ وہ ایسے علاقے میں چلے گئے کہ انہیں دو ہفتے گھاس اُبال کے کھانی پڑی اور وہ لوگ گھاس ہی اُبال کے کھاتے رہے اور بالکل ٹھیک ٹھاک تندرست رہے۔ اب بتاؤ۔ اگر جنگ کے دوران میں کنیڈا کے یورپین لوگ گھاس کھا سکتے ہیں تو قحط کے دوران میں ہندوستان کے لوگ گھاس کیوں نہیں کھاتے؟

کیا کہا؟ بیجاپور میں لوگ گھاس ہی کھا رہے ہیں۔ گجرات میں بھی۔ ٹھیک ہے ان احمقوں کے ساتھ ایسا ہی سلوک ہونا چاہیے۔ کورے احمق ہیں یہ لوگ۔ کیا کہا تو نے؟ احمق نہ ہوتے تو کوڑے کے ڈھیر میں غذا کیوں ڈھونڈتے؟ سوراج میں آزادی کیوں دیکھتے؟ اور اٹلانٹک چارٹر میں امن کیوں تلاش کرتے۔ اور سرمایہ دار سے محبت کی امید کیوں رکھتے ----؟ کون ہے تو جو ہم دو شریف آدمیوں کے

بیچ میں بولتا ہے؟ ارے تو اس ہوٹل کا بیرا ہے! یہاں ہمارے پاس کھڑے ہو
کے ہماری باتیں سنتا ہے؟ تو بھی مجھے کیمونسٹ معلوم ہوتا ہے۔ میں ابھی مینیجر سے
تیری رپورٹ کرتا ہوں۔۔۔۔۔ نہیں نہیں یار اب میں اور نہیں پیوں گا۔ اس سالی
سے نشہ ہی نہیں ہو رہا!"

مُورتیاں

وہ میری گوڈرڈ کی ایک تصویر دیکھ کے واپس آرہا تھا، جو شہوانی جذبات سے معمور تھی، ہالی وڈ کی تصویریں اب کیسی بے جان اور نکمی ہوتی جارہی ہیں اس نے سوچا جب سے امریکی کمیٹی نے ہالی وڈ کے اچھے اچھے ڈائرکٹروں اور افسانہ نگاروں مکالمہ نویسوں اور ایکٹروں کو اشتراکیت کے الزام میں دھر کے انھیں فلم انڈسٹری سے باہر نکال دیا ہے، تب سے تو تصاویر کا معیار اور بھی پست اور غلیظ ہو گیا ہے پہلے تو پھر بھی ایک آدھ اچھی تصویر آجاتی تھی، لیکن اب ----- اب اسی تصویر کو لے لیجیے میری گوڈرڈ کی عمر چالیس برس ہے ٹھیک ہے ہندوستانی ہیروئن کے مقابلہ میں میری گوڈرڈ نے اپنے حسن کو بہت حد تک وقت کی دستبرد سے بچا کے رکھا ہے ہندوستانی ہیروئن دونوں ہاتھوں سے اپنا حسن لٹاتی ہے، ہالی وڈ کی ہیروئن دونوں ہاتھوں سے اُسے سمیٹتی ہے سنبھالتی ہے، لیکن وقت کے داؤں سے کوئی کب تک بچ سکتا ہے، اب میری گوڈرڈ ہی کو لے لیجیے چالیس برس کے بعد بھی کمبخت حسین معلوم ہوتی ہے لیکن اتنی ہی حسین جتنی ایک چالیس برس کی عورت حسین معلوم ہو سکتی ہے، اس کے ہونٹوں کے کنارے، اس کی آنکھوں کے گوشے اس کی گردن

کی لکیریں، اس کے شانوں کے پیچھے ڈھلکا ہوا گوشت صاف صاف اس کی عمر کی داستان بتا رہا ہے گو اس داستان کو خوبصورت کپڑوں اور دلکش چال میں چھپانے کی بے حد کوشش کی گئی ہے، لیکن یہ فریب کامیاب نہیں ہے، مذاق سلیم پر گراں گذرتا ہے۔ اس نے سوچا مذاق سلیم پر آج کل ہر شام گراں گذرتی ہے، نہ کوئی تصویر اچھی آتی ہے نہ کہیں کوئی مجلس ہوتی ہے، ہوٹلوں، سینماؤں اور کلچر گھر دل کے پروگرام اتنے فرسودہ ہوتے جا رہے ہیں کہ اسے اس بازاری کلچر سے گھن آنے لگی ہے۔ اب وہ کہاں جائے، کیا کرے، کبھی کبھار تو اس کی زندگی میں تفریح کرنے کا لمحہ آتا ہے اور وہ اسے بھی اچھے ڈھنگ سے صرف نہیں کر سکتا یہی سوچتا سوچتا وہ تھرڈ کلاس کا ٹکٹ لے کے لوکل گاڑی کے ایک کونے میں کھڑکی کے پاس بیٹھ گیا۔ کھڑکی کے سامنے دور کسی بلڈنگ پر جہاں نیان روشنی میں لکھا تھا جانی واکر" جانی واکر اور میری گو ڈرڈ" اس نے سوچا "یہ ہے موجودہ نظام زندگی کا حاصل" اور وہ سوچتا ہے ...... کبھی انسان اتنا بلند ہمت ہوگا کہ وہ سارے نظام عالم پر اپنی مہر ثبت کر سکے گا ...... وہ چاند تک پہونچے گا، مریخ کی سیر کرے گا.... زہرہ کی فضاؤں میں اقبال کے ترانے گونجیں گے، مشتری کی سرزمین پر شیکسپیئر اور کالی داس کے ڈرامے کھیلے جائیں گے۔ انسان اور اس کا محبوب تخیل عمل کی راہ سے چلتا ہوا نئے ستاروں کو پھاند تا جائے گا۔ میری گو ڈرڈ اور جانی واکر اس زندگی میں کیسے ممکن ہے ---

دو لڑکے اس کے سامنے آکے بیٹھ گئے، وہ آپس میں بڑے انہماک سے گفتگو میں مصروف تھے، بحث کہیں پہلے ہی سے چھڑی ہوئی تھی اور اب گاڑی

میں آکر بھی جاری رہی ۔

ایک لڑکے نے جس کی آنکھوں پر عینک تھی، اور جس کے سامنے کے دو دانت باقی دانتوں سے چھوٹے تھے، دوسرے لڑکے سے کہا، "ہم سے فیس پہلے ہی نہیں دی جاتی تھی اب کہاں سے دیں گے۔ ایک تو میڈیکل کالج کی کتابیں اس قدر مہنگی ہیں پچیس روپیہ سے کم میں تو کوئی کتاب آتی نہیں اِدھر سے فیس بڑھ گئی ہے۔ اپنی تو آفت ہے ۔"

دوسرے لڑکے نے بھی عینک پہن رکھی تھی۔ اس کی مضبوط ٹھوڑی ذرا آگے کو بڑھی ہوئی تھی جس سے ہونٹ ذرا اندر کو چلے گئے تھے۔ اس کے چہرے کا عیب، نمایاں ہو گیا تھا۔ یہ پہلے لڑکے سے کم عمر تھا اس لیے زیادہ بے فکری سے اور بلند لہجے میں بات کرتا تھا۔ اس نے بڑے عقیق آمیز لہجے میں جواب دیا "اشتراکیت کے سوا کوئی حل نہیں ہے ۔"

پہلے لڑکے نے کہا "ہمیں اشتراکیت سے کیا لینا ہمیں تو ڈاکٹر ہونا ہے ایک دن ۔"

دوسرا بولا "کبھی بن جاؤ تم۔ میرا عقیدہ ہے کہ اب زندگی کی گاڑی اشتراکیت کے بغیر آگے نہیں چل سکتی ۔"

وہ ان دونوں لڑکوں کی گفتگو میں دلچسپی لینے لگا۔ اور ذرا سا آگے جھک گیا بڑے لڑکے کے دل میں شبہ پیدا ہوا۔ اس نے دوسرے لڑکے سے آہستہ سے کہا "آہستہ بات کرو۔ ممکن ہے یہاں سی۔ آئی۔ ڈی کے لوگ بیٹھے ہوں"۔ اتنا کہہ کے اس نے سامنے کی سیٹ کی طرف اشارہ کیا۔ دونوں لڑکوں نے اسے سر سے پاؤں تک

گھورا اور وہ پھر پیچھے کو ہٹ گیا اور اپنی سیٹ سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ اور کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ وہ دونوں لڑکے اسے ابھی تک گھور رہے تھے اس نے بھی انہیں گھورنا شروع کر دیا۔ دوسرے لڑکے نے مسکرا کر پہلے سے کہا معلوم کیا کہا۔ وہ سن نہیں سکا۔ بڑا لڑکا ہنسنے لگا اور کھڑکی کے باہر اشارہ کرنے لگا۔ جہاں دور فضا میں نیان روشنی میں ایک بہت بڑا پارکر کا قلم چمک رہا تھا۔ دوسرے لڑکے نے اس قدرے ہیبل پارکر کے قلم کو دیکھتے ہوئے کہا۔ میرا جی چاہتا ہے۔ اس قلم سے فضا میں موٹے موٹے حرفوں میں لکھ دوں "اٹرائکٹ اٹرکشن" بڑے لڑکے نے اُسے یاد دلایا کہ احتیاط ضروری ہے۔

دوسرا لڑکا غصے میں آکے پھر مخالف سیٹ کو گھورنے لگا۔ اور اس نے لڑکے کی نظریں اپنے چہرے پر پڑتی دیکھ کر اپنا منہ پھیر لیا اور پھر کھڑکی کی سلاخوں سے رخسار لگا کر اس نے اپنی آنکھیں بند کر لیں۔ وہ اکثر ایسا کیا کرتا تھا۔ جب گاڑی حرکت میں آتی تھی تو گاڑی کے پہیوں کی رفتار اس کے رخساروں کے اندر موسیقی کی لرزش بن جاتی تھی اور اسے بڑا سرور حاصل ہوتا تھا۔ اسے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ تھرڈ کلاس کے ڈبے میں نہیں بیٹھا ہوا ہے کسی کھلی گاڑی میں بیٹھا ہوا تاروں بھرے آسمان کے نیچے کسی اکیلی سڑک پر اڑتا چلا جا رہا ہے اور ہوا کے ٹھنڈے جھونکے اس کے بالوں میں انگلیاں پھیر رہے ہیں اور چاندنی اس کے گالوں کو اپنی نرم نرم صباحت سے تھپتھپا رہی ہے اور پہیوں کی رفتار کی تال اس کے رخساروں کے اندر لرزشیں پیدا کرتی ہوئی اس کے کانوں سے گزرتی ہوئی اس کے دماغ میں رقص کے ہیولے تخلیق کر رہی ہے اور وہ اسی دنیا کی

سیر کرتا کرتا سو جاتا حتیٰ کہ گاڑی کا آخری اسٹیشن آجاتا اور گارڈ آکے اُسے جگاتا۔
" اب تو اُٹھ بیٹھو۔ اب گاڑی آگے نہیں جائے گی"۔

لیکن آج ابھی اس نے مشکل سے آنکھیں بند کی تھیں کہ کسی نے اُسے ٹھوکا دے کے جگا دیا۔ یہ ایک سفید ریش سانولے رنگ کا بڈھا آدمی تھا جس نے بھورے رنگ کا ایک میلا سوٹ پہن رکھا تھا۔ اس نے سبز رنگ کی میلی کچیلی بے حد گھسی ہوئی ٹائی پہن رکھی تھی، اور اس کے ہاتھوں میں ایک چھوٹا سا تھیلا تھا۔

" بڈھے نے بڑی لجاجت سے کہا "مجھے تھوڑی سی جگہ دے دو میں یہاں بیٹھ جاؤں گا"۔

" یہاں جگہ کہاں ہے؛ پہلے ہی تین آدمی بیٹھے ہیں تم تو خود دیکھ رہے ہو"۔
بڈھے نے پھر کہا "تھوڑی سی جگہ دے دو میں سکڑ کر بیٹھ جاؤں گا اور آپ لوگوں کو بڑی اچھی اچھی تصویریں دکھاؤں گا"۔

یہ کہہ کر اس بڈھے نے آس پاس کے لوگوں کی طرف دیکھا، دو تین آدمی ایک دم بول اُٹھے "ہاں! ہاں!! یہاں آجاؤ۔ یہاں آجاؤ"۔

پھر بڈھا اسی کے پاس بیٹھ گیا اور تھکن کا ایک لمبا سا سانس لیا اور پھر اپنے تھیلے کو اپنی گود میں لے کر بولا "بڑی مہربانی ہے آپ کی"، اور وہ اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے اپنا تھیلا کھولنے لگا تھیلا کھولتے کھولتے اس کی آنکھیں چمکنے لگیں۔ اس نے تھیلے میں سے کاغذوں کی ایک پوٹلی نکالی جس پر ایک رسی بندھی ہوئی تھی۔ بڈھا اس رسی کو کھولتے کھولتے کہنے لگا "بڑی اچھی تصویریں ہیں یہ تیس سال سے یہ تصویریں میرے پاس ہیں"۔

اس نے کاغذوں کے چھوٹے پلندے الگ کئے اور اس میں سے ایک مورت نکالی، یہ نرسنگھ بھگوان ہیں۔ بڈھے نے کہا " یہ ظالموں کا کلیجہ چیر کے آن کا لہو پی جاتے ہیں۔ دیکھئے "

لکڑی کے چوکھٹے میں چاندی کی تصویر تھی، چاندی کے اوپر سنہری پالش کی ہوئی تھی، لکڑی چندن کی تھی، کبھی وہ بھی سنہرے رنگ کی ہو گی لیکن اب متواتر استعمال سے وہ بھی سیاہ ہو چکی تھی لیکن اس میں سے ابھی تک خوشبو آتی تھی

بڈھے نے کہا " اس میں اب چندن کی خوشبو نہیں ہے۔ یہ پوجا کی سالگرہ کی خوشبو ہے ۔۔۔۔۔۔ یہ دوسری تصویر دیکھئے "

دوسری تصویر کالی ماتا کی تھی،

بڈھے نے کہا " یہ بھی ظالموں کو سزا دیتی ہے، دیکھئے اس کے بیشمار ہاتھوں میں ظالم انسانوں کی کھوپڑیاں لٹک رہی ہیں، کالی ماتا ان ظالموں کی گردنوں سے لہو پیتی ہے، اور کھوپڑیوں کا ہار بنا کے اپنے گلے میں ڈال لیتی ہے۔ دیکھئے کالی ماتا "

ایک مارواڑی سیٹھ بڑے غور سے اُس مورت کو دیکھنے لگا کل پانچ مورتیں تھیں۔ ان میں ایک تو رادھا کرشن کی مورت تھی، ایک رام چندر جی کی مورت تھی، اور ایک شیو جی مہاراج تھے، بڈھا ہر مورت کو کاغذوں کے پلندے سے نکال کے اپنے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے صاف کرتا اور پھر انہیں دیکھنے والوں کے ہاتھوں میں دے دیتا،

ایک گجراتی منیم نے کہا، بڑی سُندر مورتیاں ہیں۔ یہ چاندی کی ہیں شاید "

پہلے لڑکے نے کہا: انسانی جسم کی مصوری کتنی صحیح ہے۔ دیکھو۔"

بڈھے نے کہا: "یہ تو میں نہیں جانتا کہ یہ مورتیاں چاندی کی ہیں، یا جست کی، یہ خوبصورت ہیں کہ نہیں، میں نے تو انہیں اپنی پوجا کے لیے لیا تھا۔"

مارواڑی سیٹھ نے بڈھے کی طرف غور سے دیکھا اور کہا "اس ایک مورتی کی کیا قیمت ہوگی؟"

بڈھے نے کہا: اس کی قیمت؛ اس کی قیمت کیا ہوگی میں نے تیس سال تک ان کی پوجا کی ہے۔ ان کی قیمت کیا ہوگی چھوڑیئے یہ بات۔"

دوسرے لڑکے نے کہا کوئی اور مورت دکھایئے۔ یہ تو واقعی بہت اچھی ہے۔"

بڈھے نے کہا "نہیں میرے پاس یہی پانچ مورتیں رہ گئی ہیں پہلے کوئی پچاس کے قریب ہونگی۔ اب صرف پانچ رہ گئی ہیں۔ میں نے آج سے تیس سال پہلے یہ مورتیں بڑے چاؤ سے منگوائی تھیں، یہ مورتیاں بنگلور میں ملتی ہیں اتنا خوبصورت کام کہیں نہیں ہوتا، میرے پاس سب بڑے بڑے دیوتاؤں اور دیویوں کی مورتیاں تھیں، اب صرف یہ پانچ باقی رہ گئی ہیں۔"

گجراتی نے کہا: "تو جب آپ انھیں بیچتے ہیں، تو دام بتانے میں کیا ہرج ہے؟"

بڈھے نے کہا: ۔ ۔ ۔ ۔ میں انہیں بیچتا نہیں ہوں۔ میں یہاں آنے سے پہلے کراچی میں ایڈووکیٹ تھا، وہاں اچھی خاصی گزر ہو جاتی تھی میری پریکٹس اور بھی زیادہ چل سکتی تھی لیکن مجھے شروع ہی سے پوجا پاٹ، دھیان گیان کا شوق رہا ہے۔ میرے گھر ہر روز کیرتن ہوتا تھا اور میرے گھر میں سارے دیوتا پوجے جاتے تھے، ایسی ایسی پچاس مورتیاں میرے پاس تھیں اور مجھے

ان کی پوجا کرنے میں بڑا آنند ملتا تھا۔ میرا گھر بہت بڑا اسکھی تھا۔ میری بیوی مجھ سے بڑی محبت کرتی تھی۔ میرے بچے بالے، گھر میں پرماتما کی دیا سے سب کچھ موجود تھا۔ سکھر کے قریب ایک گاؤں میں میں نے زمین بھی لے لی تھی۔ اور وہیں اپنا مکان تعمیر کر کے میں نے اپنی پریکٹس کو خیرباد کہہ دیا۔ اور دن رات اپنے دیوتاؤں کے چرنوں میں رہنے لگا۔"

بڈھا ایک لمحے کے لیے رک گیا۔

"پھر ملک تقسیم ہو گیا اور مجھے اپنا گھر چھوڑنا پڑا۔ چلتے وقت میرے گھر پر حملہ کرنے والوں نے مجھ سے کہا کہ یا تو میں اپنی مورتیاں ساتھ لے جاؤں یا میں اپنی مورتیاں چھوڑ جاؤں، اور باقی گھر کا ساز و سامان اپنے ساتھ لے جاؤں۔ وہ دونوں میں سے صرف ایک چیز لے جانے کی اجازت دیتے تھے۔ میں نے اپنی مورتیاں اٹھائیں اور باقی سامان وہیں چھوڑ کر اپنی بیوی بچوں سمیت گھر سے باہر آ گیا۔ میری بیوی نے مجھے بہت سمجھایا لیکن میں نے کسی کی نہیں سنی خیر ہم لوگ سکھر سے کراچی اور کراچی سے جہاز میں بیٹھ کر ہندوستان پہنچ گئے۔ دوسرے سندھی شرنارتھی اپنے ساتھ بہت سارا ساز و سامان لے آئے ہیں لیکن میں یہی پچاس مورتیاں اپنے ساتھ لایا۔ اور اب میرے پاس صرف یہ پانچ مورتیاں رہ گئی ہیں۔"

"باقی کہاں گئیں؟" گاڑی میں بیٹھی ہوئی ایک بوڑھی عورت نے اس سے پوچھا۔

بڈھے نے کہا "جب ہم کراچی سے یہاں آئے تو خیال تھا کہ میں یہاں آ کے پھر پریکٹس شروع کر دوں گا۔ کوئی نہ کوئی کام مل جائے گا۔ سرکار کوئی نہ کوئی کام

ہم دکھیاروں کے لیے بکانے گی۔ مگر ڈیڑھ سال سے ہم ریفیوجی کیمپ میں پڑے ہیں۔ نہ کوئی کمرہ ملتا ہے نہ کام۔ اب میں بڈھا آدمی ہوں میری عمر اب بھگتی بھاؤ میں مگن رہنے کی ہے۔ نہ کہ کام کرنے کی۔۔۔ طاقت مجھ میں ہے نہیں پھر بھی سوچا تھا کہ یہاں پریکٹس شروع کر دوں گا جوان ہوتا تو سڑکوں پر پتھر بھی کوٹ سکتا تھا، پر اب کیا کام کر سکتا ہوں یہاں آکے بیوی بیمار پڑ گئی اس کی طویل بیماری میں میں نے دس مورتیاں بیچ ڈالیں۔ میں انہیں بیچنا نہیں چاہتا تھا لیکن میں نے انہیں مجبور ہو کے بیچا میری بیوی مرگئی۔ میری دو لڑکیاں بھی مرگئیں۔ میرا بڑا لڑکا بھی مرگیا اور میں نے ایک ایک کرکے باقی مورتیاں بھی بیچ ڈالیں۔ اب میرے پاس صرف یہ پانچ مورتیاں رہ گئی ہیں۔ جب میں انہیں بھی بیچ ڈالوں گا تو پھر میرے پاس کچھ نہ رہے گا۔ پھر میں آرام سے مر جاؤں گا"

بڈھے کی آواز کانپ رہی تھی۔ گاڑی میں سناٹا تھا۔

مارواڑی سیٹھ نے کہا "یہ کالی ماتا کی مورتی مجھے دیدو۔ یہ مجھے بہت پسند ہے"

بڈھے نے کہا "یہ نہیں۔ یہ نہیں۔ اور جو چاہے لےلو۔ یہ ۔۔۔ یہ ۔۔۔ میں سب سے آخر میں بیچوں گا"

مارواڑی بولا "اچھا تو شیوجی مہاراج دیدو"

بڈھے نے شیوجی مہاراج کی مورتی نکالی۔ اسے بڑی حسرت کی نگاہوں سے تکتے ہوئے بولا "یہ لیجا۔ نہیں۔ میں اسے بھی نہیں دوں گا ابھی نہیں دوں گا میں کالی ماتا نہیں دوں گا۔ اور شیوجی مہاراج نہیں دوں گا اور نرسنگھ بھگوان بھی نہیں

دوں گا۔ یہ سب ظالموں کو مارنے والے ہیں۔ میں انھیں سب سے آخر میں بیچوں گا،
سب سے آخر میں۔"

گجراتی نے کہا "تو رادھا کرشن مجھے دیدو۔"

بڈھا بولا "اچھا ۔۔۔۔ لے لو۔"

" کتنے پیسے دوں"؟

" جو جی میں آئے دے دو۔ ان کی کوئی قیمت نہیں ہے۔ صرف شردھا کی قیمت
ہے۔"

گجراتی نے بڈھے کی گود میں پانچ کا نوٹ رکھ دیا۔ مرہٹی عورت نے شری رام
کی مورتی کے لیے تین روپئے دھر دیئے، بڈھے نے آخر بار شری رام کی مورتی
کی طرف دیکھا، رادھا اور کرشن کی مورتی کی طرف دیکھا اور پھر کانپتے ہوئے
ہاتھوں سے اس نے ان مورتیوں کو ان کے نئے گاہکوں کے حوالے کر دیا۔

گاڑی چلتی رہی۔ نوٹ بڈھے کی گود میں پڑے تھے لیکن وہ بار بار انہی
مورتیوں کی دیکھتا تھا جو دوسرے لوگوں کے پاس چلی گئی تھیں اس کے ہونٹ
کانپنے لگے۔ پھر اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے اور اس نے اپنا سر پیٹ
لیا اور روتے ہوئے گلے سے بولا "تم بھی چلے گئے، تم بھی چلے گئے! میرے
کرشن میرے رام۔"

" وہ مرہٹی عورت کہنے لگی "تمہیں دکھ ہوتا ہے تو اپنی مورتی واپس
لے لو۔"

" بڈھا بولا" ہاں ہاں مجھے واپس دیدو۔ یہ لو اپنے روپے اور تم بھائی۔"

......" وہ گجراتی سے مخاطب ہو کر کہنے لگا، تم بھی میری مورتی مجھے واپس کر دو بھگوان کے لیے، دیکھو میں تمہارے آگے ہاتھ جوڑتا ہوں۔"

گجراتی نے بھی بڈھے کی مورتی واپس کر دی، بڈھے نے اسے روپئے واپس کر دیئے۔

گاڑی میں پھر سناٹا چھا گیا۔

بڈھا آنسو پونچھ کے اپنی جگہ سے اُٹھا اور گاڑی کے کھلے دروازے کے بیچ میں استادہ آہنی ڈنڈے کا سہارا لے کر کھڑا ہو گیا۔ گاڑی تیزی سے آگے نکلی جا رہی تھی، وہ جیسے سنٹرل سے آگے آ چکی تھی اور اب اسے دادر سے پہلے کسی اسٹیشن پر نہیں ٹھہرنا تھا۔ گاڑی کے پہیے بڑی تیزی سے حرکت کر رہے تھے اور کھڑکی کی سلاخوں پر رکھے ہوئے اس کے رخسار کے اندر لرزشوں کے دائرے بن رہے تھے اور ان دائروں کے اندر سنگیت کی لہریں اُبل رہی تھی اور وہ ان لہروں کے نقرئی جھاگ پر پھسلتا ہوا کہکشاں کی دودھیا وادی میں تیرتا چلا گیا کہ یکایک اسے اک زور کا جھٹکا لگا، اور اس کی آنکھوں کے سامنے رنگا رنگ کے تارے ناچ گئے اور یکایک اسے معلوم ہوا کہ وہ اپنی سیٹ پر بیٹھا ہے اور گاڑی رکی ہے اور چاروں طرف شور برپا ہے۔

کیا ہوا؟" اس نے میڈیکل کالج کے لڑکوں سے پوچھا۔

"بڈھے نے گاڑی سے چھلانگ لگا دی"! گجراتی بولا۔

وہ گاڑی سے اتر کر لائن کے کنارے کنارے چلا گیا، جدھر بڈھے کی لاش پڑی تھی۔ اس کے گھٹنے کٹ گئے تھے، اور ایک بازو۔ اور اس کی مورتیاں ریزہ ریزہ

ہو کے اس کے چاروں طرف بکھری ہوئی تھیں، رادھا الگ پڑی تھی، کرشن الگ رام کا تاج ان کے سر سے جدا تھا، اور جہاں بڈھے کا سر تھا وہاں کالی ماتا اپنا منہ کھولے لال لال لہو چاٹ رہی تھیں اور اس منظر کے گرد بہت سارے لوگ جمع تھے۔

کسی نے کہا "سندھی شرنارتھی تھا" "مورتیاں بیچتا تھا"

"بیچ بیچ بیچارہ" کسی نے کہا۔

اور اس نے سوچا چلو اچھا ہوا بڈھا مر گیا۔ پچھلا زمانہ تو ختم ہوا جب لوگ رام اور کرشن کی مورتیاں بیچتے تھے، اب یہ زمانہ بھی ختم ہو جائے گا، جب لوگ فلم ایکٹرلیسوں اور لیڈروں کی تصویریں بیچتے ہیں۔ پھر اس انسان کا زمانہ آئے گا جب وہ نہ اپنا دھرم بیچے گا، نہ اپنی بیٹی کا حسن نہ اپنے ہیرو کی عزت۔۔

وہ پلٹ کر اپنے ڈبے کے اندر چڑھ گیا۔ کالج کے لڑکوں نے سندھی شرنارتھی کے موضوع کی شہ پا کر پھر اشتراکیت پر بحث شروع کر دی تھی۔ لیکن اسے اندر آتے دیکھ کر وہ پھر چپ ہو گئے۔

اس نے چھوٹے لڑکے سے کہا "نڈر ہو کے بات کرو، خیالی تصویریں بیچنا بند کرو۔ جاؤ ساری دنیا کی فضا پر اپنے قلم سے بڑے بڑے حرفوں میں لکھ دو اشتراکیت۔۔ ۔ اب تمہیں کوئی روکنے والا نہیں ہے؟"

سیٹھ جی

سیٹھ جی کے ہونٹ بڑے بڑے موٹے اور شہوانی تھے۔ ان کی ناک لمبی اور ٹیڑھی تھی اور آنکھوں میں شائیلاک کی سی مکاری جھلک رہی تھی۔ میں جب ان کے دفتر میں پہونچا تو وہ فوراً اپنی کرسی سے اٹھ کھڑے ہوئے اور بڑے تپاک سے ہاتھ ملاتے ہوئے کہنے لگے۔ " ہا ہا! آپ آئے ہیں! ارے بھائی کرشن جی آئے ہیں ۔ ایک کرسی اندر بھیج دو ۔"

ایک چپراسی کرسی لے کر آیا۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ میں نے سیٹھ جی کے مسکراتے ہوئے چمکتے ہوئے چہرے کی طرف دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا تھا کسی نے ان کے چہرے پر بناسپتی گھی کا ڈبہ انڈیل دیا ہے یہ مسکراہٹ اسی نقلی گھی میں فرائی کی ہوئی معلوم ہوتی تھی۔ سیٹھ جی نے اپنے پیلے پیلے دانت نکالے، اپنے ہاتھ ملے اور ایک عجیب منحنی باریک سی ہنسی سے جو کسی شیطانی گھوڑی کی ہنہناہٹ سے مشابہت رکھتی تھی، کام لیتے ہوئے بولے "ارے واہ واہ دھن بھاگ ہمارے! کرشن جی آئے ہیں۔ میں نے ہر چند بھائی سے کہا تھا کہ کرشن جی کبھی ملیں تو ہمارے پاس بھیج دینا۔ ارے بھائی لاکھ دو لاکھ کی بات ہی کیا ہے یہ گرچ تو جب چاہو پوری کر لینا ہم سے تم نے تو ملنا بھی چھوڑ دیا۔"

میں نے کہا، میں آج سے چھ ماہ پہلے اسی کام کے لیے آپ کے پاس حاضر ہوا تھا آپ نے اتنے پھیرے کرائے کہ میرے جوتے کے اندر کا موزہ بھی گھس گیا۔

''ہا ہا ہا'' سیٹھ صاحب ہنستے ہوئے بولے، آپ بڑے حسّ مزاک معلوم ہوتے ہیں، جوتے کے اندر کا موزا بھی گھس گیا ہا ہا ہا! ایسا مزاک تو ہم نے کسی فلم میں نہیں سنا اس کو لکھ ڈالو نا کسی فلم میں تمہاری قسم ہے بہت چلے گا ہا ہا ہا!

ہنستے ہنستے سیٹھ جی کی آنکھیں بند ہو گئیں اور ان کے پیٹ میں لرزشیں پیدا ہونے لگیں، جب اچھی طرح ہنس چکے تو گھنٹی بجا کے بولے، کچھ پیو گے، کوئی ٹھنڈا ونڈا؟

''ہاں ٹھنڈے سوڈے میں وِھسکی ڈال کے پیوں گا''

اس کے بعد آپ نے پھر ہنسنا شروع کر دیا، ایک لڑکا گھنٹی کی آواز سن کر اندر آیا، اور اپنے موٹے سیٹھ کی توند میں ہنسی کی لہریں اٹھتی دیکھ کر مودب کھڑا ہو گیا، جب یہ طوفان رکا تو سیٹھ نے لڑکے سے کہا ''دو بہت اچھی وِمٹو کی بوتلیں لاؤ'' جب لڑکا چلا گیا تو آپ میرے آگے جھک کے میری طرف دیکھنے لگے۔ میں چاہتا ہوں کہ آپ روپیہ مجھ سے سوا دو کی بجائے ڈھائی لاکھ لے لیں لیکن پکچر ایسی ہو جو بالکل کلاسکل ہو''

میں نے کہا، کلاسیکل سے آپ کا مطلب کلاسیکل میوزک سے ہے شاید؟ بہت اچھا، میں دلیپ چند دیدی سے عرض کروں گا کہ وہ اس کا میوزک سنبھال لیں ۔ ۔ ۔

''نہیں نہیں'' سیٹھ جی بولے، آپ میرا مطلب غلط سمجھے، آپ ایک ایسی

پکچر بنائیں جو کلاسیکل ہو۔ یعنی جس کا جواب دُنیا میں نہ ہو۔ آپ سمجھ گئے نا میرا مطلب؟ ایک دم فاسٹ۔ سمجھے!"

"سمجھ گیا" میں نے کہا۔ "مگر ایسی پکچر ہندوستان میں دیکھے گا کون؟ دیکھئے! اس سے پہلے تین چار تجربے ہم لوگ کر چکے ہیں۔ ایک تو وہ قحطِ بنگال کے بارے میں تصویر تھی، ملک اور ملک سے باہر کے بڑے بڑے مشاہیر نے یہ تصویر دیکھی اور اس کی بڑی تعریف کی۔ اور روس اور امریکہ اور انگلینڈ کے فلمی ناقدوں نے بھی اسے بہت سراہا لیکن یہاں کہیں بھی تین چار ہفتے سے زیادہ نہیں چلی۔ آپ ایسی ہی تصویر چاہتے نا؟"

"نہیں نہیں۔ ایسا پکچر کیا کرنا اپنے کو!"

میں نے کہا "تو پھر ایک پکچر وہ تھی جس میں غریبی اور امیری کا تضاد بڑی خوبصورتی سے دکھایا گیا تھا۔ اداکاروں نے بہت خوبصورت طریقے سے اپنا کام سرانجام دیا تھا۔ ڈائریکٹر نے بھی بڑی کاوش سے وہ تصویر بنائی تھی۔ بنی ہندوستان میں تھی لیکن جب فرانس میں اس کی نمائش کی گئی تو وہاں کے فلمی مبصروں نے اُسے اس سال کی بہترین فلم قرار دیا۔ مگر ہندوستان میں ابھی تک وہ ڈبوں میں بند ہے اگر آپ چاہیں تو بس۔"

"باپ رے! یہ میں نے ایسی پکچر کے لیے کب کہا ہے۔ آپ سے میں تو کچھ اور ۔۔۔"

میں نے کہا "تو پھر شاید آپ وہ تیسری پکچر چاہتے ہیں جس میں گانے اور ڈانس بھی عوام کے مذاق کے تھے۔ لیکن اس کی کہانی ریاستی جاگیرداروں کے خلاف

تھی۔

"جس کا ہر حصے کی ریاستوں میں اس کی نمائش خلاف قانون دی گئی اور ڈسٹری بیوٹر آہتک بنانے والے کی جان کو رو رہے ہیں۔ مگر پکچر اچھی خاصی تھی۔ بچارے ریاستی عوام کی زندگی کی عکاسی ـ

سیٹھ گھبرا کے بولے" اپنے کو اکاسی باسی کچھ نہیں چاہیے۔ اپنے کو تو ایک سیدھی سادی پکچر۔"

میں نے بات کاٹ کے کہا" تو ایک وہ پکچر ہے۔ بڑی سیدھی سادی محبت کی کہانی ہے۔ مگر اس کا موضوع تھا زمین کسانوں میں بانٹ دو پکچر تین دفعہ سنسر ہوئی۔ آخر میں نہ زمین کسانوں کے پاس رہی نہ کسان رہے۔ خالی خولی محبت کی کہانی رہ گئی۔ شہد لگا کر چاٹنے کے لیے۔"

سیٹھ بولے نا بابا، میں باز آیا۔ ایسی پکچر اپنے کو نائیں چاہیے۔ جب تو ایک کوڑی نہیں دوں گا۔ میں تو ایسی کلاسیکل پکچر چاہتا ہوں جیسی کھڑکی سنتوشی شہنائی ؟"!

میں نے کہا "کھڑکی اور شہنائی تو فلمیں ہیں لیکن سنتوشی کوئی فلم نہیں ہے وہ تو کھڑکی اور شہنائی کے ڈائریکٹر صاحب کا نام ہے۔"

"ہا ہا ہا" سیٹھ صاحب ہنستے ہوئے بولے" دیکھئے کیسی جی! ناموں میں کیسے گڈمڈ ہو جاتی ہے؟" پھر وہ ایک دم چونک کے بولے" مگر سنتوشی نام بھی تو بُرا نہیں۔ فلم کا نام سنتوشی رکھ دیں! کیسا رہے گا؟"

"نام تو بہت اچھا ہے مگر سنتوشی صاحب آپ پر دس لاکھ کے ہرجانے کا دعویٰ

کر دیں گے۔"

"اچھا جی!" سیٹھ صاحب کرسی پر تلملائے، تڑپے اور پھر ایک دم عش ہو کر بیٹھ گئے، جیسے ان کے سامنے ساری دنیا میں اندھیرا چھا گیا ہو۔

میں نے کہا "سنتوشی تو نہیں لیکن بے ہوشی نام کیسا رہے گا؟"

سیٹھ کرسی سے اچھل پڑے اور بڑے زور سے ہاتھ ملاتے ہوئے بولے "واہ واہ کشن جی! کیا نام سوچا ہے بے ہوشی! بڑا اچھا نام ہے۔"

میں نے کہا "اور اس میں جتنے کیریکٹر ہیں سب بے ہوش ہوتے جاتے ہیں ہیرو، ہیروئن، ولن، سائڈ ہیروئن، سنیاسی، سائڈ ہیرو، سائڈ ولن سب ایک ایک گانا گاتے ہیں اور گاتے ہی بیہوش ہوتے جاتے ہیں کیسا رہے گا سیٹھ!"

"کمال کر دیا کشن جی! مگر کتنے گانے رکھو گے آپ؟"

"تیس گانے رکھوں گا کیونکہ کیریکٹر بہت ہوں گے نا۔ اور پھر ہر گانے کے بعد بے ہوشی ہو گی۔ گویا ہر دفعہ نیا ڈرامہ پیدا ہوگا۔ میں تو سمجھتا ہوں سیٹھ پکچر لگتے ہی ہال میں ساری پبلک بے ہوش ہو جائے گی۔"

"واہ واہ" سیٹھ جی خوشی سے ہاتھ ملتے ہوئے بولے "بنالو بنالو ہے اک دم نیا! میں ابھی اوپیرا ہاؤس بک کرتا ہوں اس کے لیے۔"

میں نے کہا "ہاؤس تو بہت اچھا ہے۔ مگر پبلک کی بیہوشی کے لیے ذرا چھوٹا رہے گا۔ کوئی بڑا سا ہال لیجئے اور وہاں سے کرسیاں ہٹوا دیجئے۔ تاکہ لوگ پکچر دیکھتے جائیں اور اس فرشِ خاک پر بیہوش ہوتے جائیں۔ دیکھئے گا

سیٹھ جی! کیسی باکس آفس پکچر بنتی ہے۔ لایئے ابھی چیک کاٹ دیجیے۔"
"چیک تو دیتا ہوں، مگر اس میں میرا شیئر بھی رہے گا، پکچر بھی گروی رکھوں گا، اور سود اور رائلٹی بھی لوں گا۔"
میں نے کہا "سب منظور ہے"۔
وہ بولے "ایک اور شرط ہے۔ اس پکچر میں میرا شیئر ہے اس لیے میں نہیں چاہتا کہ پکچر کے بیچ میں کوئی شرارت ہو۔ ہمارا نام بدنام ہو۔"
"وہ کیسے ہو گا؟" میں نے پوچھا۔
"بس یہی کہ اسٹوڈیو کے اندر کوئی شراب نہیں پیئے گا۔ کوئی سگرٹ نہیں پیئے گا۔ کوئی لڑکیوں کی طرف بُری نظر سے نہیں دیکھے گا"
میں نے کہا "وہ تو سب ٹھیک ہے، مجھے منظور ہے، مگر یہ شراب کے بیے ذرا اتنی مشکل ہے کہ اگر میرے خیال میں کوئی ایک آدھ پیک پی کے آجائے تو اُسے کیسے روک سکتے ہیں۔ ایک آدھ پیک تو ڈاکٹر بھی زبردستی پلا دیتے ہیں بیمار لوگوں کو۔"
سیٹھ نے کہا "ارے ایک آدھ پیک کی بات کیا ہے وہ تو ٹھیک ہے خیر میں چیک لکھتا ہوں۔"
وہ چیک لکھنے لگے میں نے ذرا وقفہ کے بعد کھنکھار کے کہا "اور سگرٹ سے تو خود مجھے وحشت ہوتی ہے، یعنی ہر وقت منہ سے تمباکو کی بو آتی ہے جیسے آج آپ کے منہ سے پیاز کی بو آرہی ہے، اور ۔۔۔"
سیٹھ جی ایک دم چونک کے بولے "کیا میرے منہ سے پیاز کی بو آرہی

ہے۔۔۔؟"

"بو نہیں بھپارے آرہے ہیں۔"

سیٹھ جی نے غصہ میں گھنٹی بجائی، چپڑاسی آیا سیٹھ جی نے چپڑاسی سے کلونت کو بلانے کو کہا کلونت آیا تو سیٹھ اس پر برس پڑے "بدمعاش سالے"! تو نے بتایا نہیں۔ آج سالن میں اتنی بھنی ہوئی پیاز تھی کہ منہ سے بو آنے لگی، سالے! مجھے معلوم نہیں! دس سال سے ہمارے یہاں کام کر رہا ہے اور تجھے یہ معلوم نہیں کہ میں لنچ میں بھنی پیاز نہیں کھاتا ہوں۔ کیسا جنگل کے مافق گدھا ہے نکل جا، ابھی جا۔ منیم جی سے حساب چکا کر لے۔"

کلونت سر جھکائے چلا گیا۔

میں نے کہا، بات پیاز کی نہیں سگریٹوں کی ہو رہی تھی، دراصل سگریٹ پینا بہت بری بات ہے۔ لیکن کبھی کبھی اسٹوڈیو میں جب آدمی رات دن کام کرتا ہے۔ تو ایک اعصابی کیفیت پیدا ہو جاتی ہے، اس کے لیے کبھی کبھار سگریٹ پینا بہت مفید ہوتا ہے۔"

"سیٹھ نے کہا نہیں نہیں میں ایسے سگریٹ پینے کو تھوڑا ہی منع کرتا ہوں۔"

"باقی رہی لڑکیوں والی بات" میں نے کہا "اس پر تو ظاہر ہے کسی شریف آدمی کو کیا اعتراض ہو سکتا ہے۔ لڑکیوں کو بری نظروں سے دیکھنا بہت برا ہے مگر آپ جانتے ہیں۔ سچی محبت کو کوئی نہیں روک سکتا جہاں عورت اور مرد ملیں گے وہاں سچی محبت بھی ہوگی جیسے آج تک انڈسٹری میں ہزاروں بڑے بڑے جاگیرداری قسم کے پروڈیوسر لوگوں سے لیکے معمولی اکسٹرا لوگوں تک کو یہ

چکی ہے ۔ ایسے لوگ بھی ہیں جنھوں نے دو دو شادیوں کے بعد سچی محبت کی ہے ۔ اب اس چیز کو روکنا تو بہت مشکل ہوگا ۔"

سیٹھ جی بولے "سچی محبت کو میں کب بولتا ہوں کہ منع کردو ۔ اپن خود ایک بار اس جھنجھٹ میں پھنس گئے تھے ۔"

"میں نے آنکھ مار کے کہا "سچ سچ سیٹھ جی ، آپ بھی ! یقین نہیں آتا !"

"قسم لے لو کرشن جی تمہارے ہی سر کی قسم ، جو جھوٹ بولوں ۔ وہ (ہائے میں مرگیا) پھلم کی ہیروئن ، نہیں ، رام تمہارا بھلا کرے ، ہیروئن نہیں سائڈ میں کون تھی لڑکی" !

"جوگیشوری ؟"

"ہاں ہاں جوگیشوری سے ہمارا پریم ہوگیا ۔ بڑھتے بڑھتے دو تین بچے بھی ہوگئے ۔ اب وہ کولابے میں ہے میں اس کو خرچہ پانی سب دیتا ہوں ، کبھی کبھی کولابے جاتا ہوں ، تو قسم لے لو ۔ بالکل اپنی دھرم پتنی کی طرح لگتی ہے اب ایسے پریم کی کون مناہی کرتا ہے ۔ ۔ ۔ ؟ میں یہ تھوڑے ہی کہتا ہوں ۔ کر بالکل کمیونسٹ ہوجاؤ ۔"

"ہاں ہاں وہ تو ظاہر ہے" میں نے کہا "آپ کا یہ مطلب تھوڑے ہی ہوسکتا ہے"

سیٹھ جی چک انگلیوں میں پھراتے ہوئے بولے "کرشن جی ! یہ میں کیا سن رہا ہوں کمیونسٹ چین کو لے گئے !"

"ہاں لے گئے ۔"

"اور ادھر ملایا میں بھی ان کی بدمعاشی ہے" ؟

"سُنتے تو یہی ہیں"

آج صبح میں نے خبر پڑھی کہ رنگون سے دس میل اُدھر لڑائی ہو رہی ہے وہاں بھی یہ دنگا چل رہا ہے ٹھیک سے کہا؟

میں نے کہا آپ نے ٹھیک پڑھا ہے۔

سیٹھ جی چیک انگلیوں میں گھماتے ہوئے رک گئے۔ انہوں نے غور سے چیک کی طرف دیکھا، میری طرف دیکھا، چیک کی طرف دیکھا میرے اور چیک کے درمیان صرف ۱۰ ۱۰ انچ کا فاصلہ تھا سیٹھ جی نے ایک ٹھنڈی سانس بھری اور آہستہ سے چیک کو پھاڑتے ہوئے بولے کشن جی۔ اب ہمارا بیوپار نہیں چلے گا۔ اب یہ سودا کرنے کا وقت نہیں ہے۔

کشمیر کو سلام

یہ بات کہ کشمیر جنت نظیر ہے مجھے اس وقت تک نہیں معلوم ہوئی

جب تک میں اس جنت سے باہر نکلا نہیں گیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ میں چونکہ بچپن ہی سے کشمیر میں رہتا سہتا چلا آیا تھا۔ اس لیے میرے لیے کشمیر کے مرغزاروں کی خوبصورتی اس کی وادیوں کی دلکشی۔ اس کی جھیلوں کی رعنائی اور اس کے پہاڑوں کی پھبن اور دوشیزگی کوئی اچنبھے کی بات نہیں تھی۔ میں سمجھتا تھا شاید ساری دنیا میں اسی طرح کی خوبصورتی ہوتی ہوگی ایسے حسین مناظر ہر جگہ پائے جاتے ہیں گے۔ ہر جگہ ڈوبتا ہوا سورج اسی طرح جھیل کی نیلاہٹوں میں سونا ردن ہوگا۔ اسی طرح شبنمی دھندلکوں میں کسی انجان گھاٹی پر لاکھوں رنگ کے پھول کھِل جاتے ہوں گے، پہاڑ کے تناور درختوں کا جھنڈ اسی طرح کسی خاموش پر اسرار دتے پر کھڑا ایک سلسلہ کوہ سے دوسرے سلسلہ ہائے کوہ کو دیکھتا ہوا شہد کے چھتوں میں کام کرتی ہوئی شہد کی مکھیوں کی گونج سے چونک پڑتا ہوگا جس طرح شفق زدہ ڈل میں چپو چلاتی ہوئی کسی نازک اندام کشمیری حسینہ کے ہاتھوں سے برف پوش چوٹیوں کا عکس چونک کر ٹوٹ جاتا ہے یہ اور ایسے ہزاروں خوب صورت مناظر دوسری جگہوں پر

بھی پائے جاتے ہوں گے۔ ایسا میں اپنے بچپن میں اپنے لڑکپن میں اور اپنی جوانی کے پہلے دنوں میں سوچتا تھا۔

لیکن جب میں اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے لئے اپنے والدین کی مرضی سے کشمیر سے باہر گیا، اس وقت مجھے معلوم ہوا کہ میں کتنا غلط سوچا کرتا تھا، جنت کی قدر جنت سے باہر نکل کر ہی معلوم ہوتی ہے، یہ بات نہ تھی کہ کشمیر سے باہر دنیا خوب صورت نہ تھی، ساری دنیا حسین ہے، دلکشی اور رعنائی اور موہنی دنیا کے ہر کونے میں ہے لیکن فطرت کی جو رعنائی، نکھار اور رنگ میں نے کشمیر میں دیکھا ہے، کہیں اور نہیں دیکھا۔ اس سے بہتر واضح مترتب صورت میں نے کبھی نہیں دیکھا، ممکن ہے یہ میرے بچپن کا خیال ہو۔ اور آپ جانتے ہیں کہ بچپن کے خیالات کتنے مضبوط ہوتے ہیں، وہ کسی طرح دل کے رگ ریشے میں اپنی جڑیں پھیلا لیتے ہیں۔ میں نے ایسے دوستوں کو بھی دیکھا ہے جو اپنے گاؤں کے اہلی کے جھاڑ کا ذکر بھی اسی انداز سے کرتے ہیں، جس انداز سے میں کشمیر کی گل پوش وادیوں کا ذکر کرتا ہوں۔ شائد جنت کہیں انسان کے دل کے باہر نہیں ہے۔ وہ اس کے دل کے اندر ہے اگر ایسا ہے تب بھی مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں ہے کہ میرے دل کے اندر جو جنت ہے وہ کشمیر ہے۔

آج کل میں اس جنت سے دور رہتا ہوں لیکن پھر بھی اس کی یاد کسی سدابہار پھول کی طرح دل میں ہر وقت مہکتی رہتی ہے۔ اور جب میں صبح دم چھوٹے چھوٹے سفید بادلوں والی کشتیوں کے پرے سمندر میں سورج کی کرنوں کو

اپنا زرّیں جال پھینکتے ہوئے دیکھتا ہوں، تو مجھے وہ صبح یاد آجاتی ہے جب میں نے پہلی بار جھیل ولر کو دیکھا تھا۔ جب ہلکی ہلکی دھند ایک ریشمی آنچل کی طرح بار بار گالوں سے چھو جاتی تھی۔ اور جھیل کی نیلی سطح ساکن تھی، اور دور دور نیلگوں پہاڑ ایک دائرے کی صورت میں پھیلے ہوئے تھے۔ اور چپو میرے ہات میں رک گیا تھا۔ اور میری کشتی کے قریب نیلوفر کے پھول حیرت سے مجھے دیکھ رہے تھے۔ اور دور ایک لمبی سی کشتی میں ایک ملاح بیٹھا تھا۔ اور اس کی بیوی ایک بچے کو گود میں لیے کھڑی تھی، اور ادھر دیکھ رہی تھی جدھر سے سورج طلوع ہوتا ہے مجھے اس وقت وہ ماں بالکل مجسم دعا معلوم ہوئی جیسے دھرتی ماتا ہو اور آسمان کائنات کا مندر ہو، اور بچہ لوبان کی مہک ہو، اور پھر نیلگوں چوٹیوں سے سورج ابھر آیا اور یکایک بچہ کھلکھلا کر ہنس پڑا اور ساری دنیا جاگ گئی اور مجھے ایسا معلوم ہوا جیسے ملاح کا چپو اور نیلوفر کے کانپتے ہوئے پھول، اور جھیل کی خاموش سطح اور پہاڑوں کی نیلگوں چوٹیاں سانس روکے اس ہنسی کی منتظر تھیں، سورج نکلا بچہ ہنسا اور دنیا جاگ گئی اور رنگوں سے معمور ہو گئی۔

یاد کی سرمئی وادیوں میں کشمیر کے کئی نگینے چمک اٹھتے ہیں۔ بہرام گلے سے پرے ایک وادی تھی، جہاں میں راستہ بھول کر آ نکلا تھا۔ مکئی کا ایک ڈھلوان کھیت تھا جس میں فصل اچھی طرح پھولی پھلی نہیں تھی۔ مکئی کے پودے چھدرے چھدرے تھے اور آڑے ترچھے اُگے ہوئے تھے۔ کھیت کے بیچ میں ایک مچان تھا، جو بھوری گھاس سے چھپا ہوا تھا لیکن مچان پر کوئی

نہ تھا، دوپہر کا وقت تھا اور مجھے بہت زور کی بھوک لگ رہی تھی میں آگے بڑھتا چلا گیا۔ آگے گھاس کا ایک لمبا سا قطعہ تھا جس میں ڈیفی ڈوڈل کے پیلے پیلے پھول کھلے ہوئے تھے۔ اس سے آگے اونچائی پر آلوچے کا ایک پیڑ تھا جو سفید پھولوں سے بھرا ہوا تھا۔ اور اس کے قریب ایک چھت تھی۔ جس پر اُس کے گھر کے لوگ کھانا کھا رہے تھے۔ ایک بڈھا موچی تھا جس کی سفید داڑھی تھی اور تانبے ایسی رنگت تھی ایک اُس کا جوان بیٹا تھا جس کی نیلی آنکھوں میں ایک خوش آئندہ تبسم تھا۔ ایک اس جوان بیٹے کی خوبصورت بیوی تھی جس کی گود میں ایک پیارا سا بچہ تھا۔ دو بہنیں تھیں، ایک ان کا چھوٹا بھائی تھا جس نے صرف ایک میلی چکٹ سی قمیض پہن رکھی تھی، اور جو مجھے دیکھ کر کھاتے کھاتے ٹھٹھک گیا تھا، اور چاول اور کرم کا ساگ اس کی انگلیوں سے لگا ہوا تھا، اور اس کی آنکھوں میں وہ حیرت تھی، جو اجنبی کو دیکھ کر ہوتی ہے اور لبوں پر وہ تبسم تھا جو ڈر سے نہیں، بے فکری سے پیدا ہوتا ہے۔ مجھے دیکھ کر بڈھا موچی مسکرایا۔ اس نے مجھ سے یہ بھی نہیں پوچھا کہ تم کون ہو۔ کہاں سے آئے ہو۔ کدھر جا رہے ہو۔ تمہارا نام کیا ہے تمہارا مذہب کیا ہے؟ اور اس نے مجھے کھانا کھانے کو کہا۔ اور میں وہیں اس سرخ بجری کی چھت پر بیٹھ کر ان لوگوں کے ساتھ کھانا کھانے لگا، اور ایک بہن نے میرے سامنے مٹی کے پیالے میں چاول اور ساگ رکھ دیا، اور سفید مکھن کا ایک گولا۔ اور سرخ پسی ہوئی مرچیں اور نمک۔ اور میں کھانے لگا، اور ہم لوگ اس طرح باتیں کرنے لگے، جیسے وہ لوگ برسوں سے مجھے جانتے ہوں جیسے میں ان کے

گھر کا ہی ایک فرد ہوں۔ اور پھر کھانا کھا کے بڈھا موچی ایک چھوٹے سے رندے سے چمڑا کھلانے لگا۔ اور جوان بیٹا کھلی ہوئی دھوپ کو تیز سمجھ کر آلوچے کے پیڑ کے نیچے بیٹھ کر ایک پرانے جوتے میں تلا لگانے لگا، اور مجھ سے باتیں کرنے لگا، اور مجھ سے باتیں کرنے لگا، اس کی بیوی بھی تاب پاس آن بیٹھی اور چادر کی اوٹ میں اپنے بچے کو چھپا کے دودھ پلانے لگی اور جوان موچی مجھ سے کہنے لگا اب کے مکئی کی فصل اچھی نہیں ہوئی ہے اُسے اولے مار گئے ہیں، اور گھاس بھی جگہ جگہ سے بیٹھ گئی ہے' اتنے میں وہ دونوں شریر بہنیں آلوچے کے پیڑ پر چڑھ گئیں اور شاخیں ہلا ہلا کر انہوں نے اتنے پھول ہم پر برسائے کہ ہم سفید سفید پھولوں سے لد گئے اور چھت کے دوسرے کونے کے قریب کھلی دھوپ میں بیٹھا ہوا بڈھا موچی ہنسنے لگا، اور کھلی دھوپ میں اس کے سفید دانت چمک رہے تھے اور اس کے "انبہ ایسے گال چمک رہے تھے۔ اور اسکی گہری نیلی آنکھیں چمک رہی تھیں، اور وہ دونوں شریر بہنیں ہم پر پھول برسا رہی تھیں۔ اور جوان موچی کے سر پر پھول تھے، اور جوتے کے تلے پھول تھے۔ اور پھول میری عینک کی کمانی پر اٹک گئے تھے، اور پھولوں سے اس عورت کی چادر بھر گئی تھی، اور اس کے بچے کے ننھے ننھے پاؤں پھولوں میں گندھے ہوئے معلوم ہوتے تھے، اور جب میں سُستا چکا تو میں نے اس بڈھے موچی کو اور اس کے بیٹے کو اور اس کی بیوی کو سلام کیا، اور پھر وہ دونوں شریر بہنیں اور ان کا چھوٹا بھائی جس نے صرف ایک میلی چکٹ قمیض پہن رکھی تھی، اور جو میری عینک کی طرف دیکھ کے ہنستا تھا، وہ

تینوں مجھے ڈھلوان سے آگے راستہ بتانے کے لیے آئے اور جب وہ مجھے راستہ پر لگا چکے تو چشمے کے کنارے کھیلنے بیٹھ گئے۔ اور شاید دوسرے لمحے ہی میں مجھے بھول گئے۔ لیکن میں انہیں نہیں بھولا ہوں وہ بے لوث ہنسی، وہ پاک محبت مہر و وفا کی وہ مقدس نشانی جو اس زندگی کے سفر میں ایک انسان دوسرے انسان کو دیتا ہے۔ وہ آج بھی میرے سینے میں اسی طرح محفوظ ہے۔

مجھے کشمیر گئے ہوئے مدتیں گذر گئیں اس عرصہ میں کشمیر بہت کچھ بدل چکا ہے۔ کیونکہ یہ جنت نظیر ملک انسانی جنت ہے اور انسانوں کی جنت ہمیشہ بدلتی رہتی ہے۔ میں نے اس زمانہ میں بھی اس جنت میں دوزخ کے دہکتے ہوئے انگارے دیکھے تھے بجھت دیاس کے مرقعے، افلاس کے بھیانک نقوش، حسن فردوس کی خرید و فروخت، میں جانتا تھا۔ یہ دہکتے ہوئے انگارے ایک روز مجبر ڈک کر آتش فشاں جوالا مکھی بن جائینگے اور یہ لاوا دور دور تک کشمیر کے حسین مرغزاروں اور وادیوں میں پھیل جائے گا۔ اور وہی ہوا جس کا مجھے اندیشہ تھا اور کشمیر کی حسین و جمیل وادی خاک و خون میں لتھڑ گئی

اور آج میں اپنی جنت نظیر سے بہت دور بیٹھا ہوں۔ اور آج میں نہیں کہہ سکتا کہ وہ ماں کہاں ہے جو طلوع آفتاب سے پہلے جھیل ولر کے بیچ میں اپنے نوزائیدہ بچے کو لیے مجسم دعا بن کے کھڑی تھی۔ اس کا وہ خاوند کہاں ہے جو دونوں ہات چپوؤں پر رکھے اسی کشتی میں بیٹھا تھا اور اپنی بیوی کو پیار بھری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔ آج میں نہیں کہہ سکتا کہ کشمیر کی اس عظیم کشمکش نے انہیں کہاں پہنچا دیا ہے لیکن وہ جہاں کہیں بھی ہوں

انہیں میرا سلام پہنچے ۔

آج مجھے پھر وہ آلوچے کا پیڑ یاد آتا ہے اور مکئی کے کھیتوں میں بھوری گھاس سے چھتا ہوا مچان اور سرخ بجری کی چھت پر بیٹھا ہوا بڈھا موچی جو رندے سے چمڑا کھا رہا ہے آج پھر میرے سر کے اوپر آلوچے کے سفید سفید پھول گر رہے ہیں ۔ اور میرے کانوں میں ان دونوں شریر بہنوں کی ہنسی ہے اور اس کے لڑکے کا تحیر نما تبسم ہے ۔ جس نے صرف ایک میلی چیکٹ قمیص پہن رکھی ہے اور جس کی انگلیوں میں سفید چاول کے دانے اور کرم کا ساگ لگا ہوا ہے ۔ میں نہیں جانتا وہ لوگ آج کہاں ہیں لیکن وہ جہاں بھی ہوں انھیں میرا سلام پہونچے ۔

شاید وہ آلوچے کا پیڑ آج پھولوں سے لدا نہیں ہے ۔ یہ بھی ممکن ہے کہ مکئی کے ڈھلوان کھیت میں کسی نے ہل نہ چلایا ہو ۔ شاید وہ بڈھا موچی اپنے گھر کی سرخ بجری کی چھت پر چمڑہ نہیں کما رہا بلکہ کسی سڑک کے کنارے پتھر کوٹ رہا ہے اور اس کا بیٹا اس عظیم کش مکش میں اپنی بہنوں کی عصمت کے لیے لڑتے لڑتے مارا گیا ہے ۔ شاید آج مکئی کے کھیت میں گھاس سے چھتے ہوئے مچان پر ایک بیوہ بیٹھی ہے جس کی کالی چادر میں نیا کشمیر دودھ پی رہا ہے ، ممکن ہے یہ سب کچھ صحیح ہو لیکن میں اتنا ضرور جانتا ہوں کہ کشمیر ہمیشہ جنت نظیر رہے گا ۔ اس خاک و خون میں تھتھڑی ہوئی وادی کو اس کے بچے خود بسائیں گے ۔ آلوچے کے پیڑ میں پھر سے پھول کھلیں گے ، مکئی کے کھیتوں میں سنہرے دانوں والے بھٹے پھر سے نظر آئیں ، مٹی کے پیالے میں چاول اور

ساگ اور مکھن ہوگا، اور بہنوں کی ہنسی ہوگی اور بھائیوں کے قہقہے۔!
فیروز پوری نالے کے اوپر ایک پن چکی ہے یہاں پتھر کے دو پاٹ تیزی سے گھوم رہے ہیں۔ پانی پن چکی سے آبشار کی طرح گر رہا ہے۔ قریب ہی گھاس کے قطعے میں لمبے لمبے ڈنٹھلوں پر بڑے بڑے سفید پھول جھکے ہوئے ہیں۔ اور ساری فضا میں سونف کے پودوں کی خوشبو ہے۔ میں نے اس مقام پر لیٹے لیٹے گورکی کا ناول "ماں" پڑھا تھا۔

آج میں پھر وہیں جانا چاہتا ہوں۔ اور اس پن چکی کے قریب بیٹھ کے وہی ناول پڑھنا چاہتا ہوں کیونکہ میرا یقین ہے کہ کشمیر کی دھرتی گورکی کی "ماں" ہے۔ وہ دھرتی میری ماں بھی ہے اور لوگ کہتے ہیں۔ کہ ماں کے قدموں تلے جنت ہوتی ہے۔"

مہالکشمی کا پُل

مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار مہالکشمی جی کا ایک مندر ہے اسے لوگ ریس کورس بھی کہتے ہیں۔ اس مندر میں پوجا کرنے والے ہارتے زیادہ ہیں، جیتتے بہت کم ہیں۔ مہالکشمی اسٹیشن کے اس پار ایک بہت بڑی بدرو ہے۔ جو انسانی جسموں کی غلاظت کو اپنے متعفن پانیوں میں گھولتی ہوئی شہر سے باہر چلی جاتی ہے۔ مندر میں انسان کے دل کی غلاظت دھلتی ہے اور بدرو میں انسانی جسم کی غلاظت اور ان دونوں کے بیچ میں مہالکشمی کا پل ہے مہالکشمی کے پل کے اوپر بائیں طرف لوہے کے جنگلے پر چھ ساڑھیاں لہرا رہی ہیں۔ پل کے اس طرف ہمیشہ اس مقام پر چند ایک ساڑھیاں لہراتی رہتی ہیں۔ یہ ساڑھیاں کوئی بہت قیمتی نہیں ہیں۔ ان کے پہننے والے بھی کوئی بہت زیادہ قیمتی نہیں ہیں۔ یہ لوگ یہاں ہر روز ان ساڑھیوں کو دھو کر سوکھنے کے لیے ڈال دیتے ہیں اور ریلوے لائن کے آر پار جاتے ہوئے لوگ مہالکشمی اسٹیشن پر گاڑی کا انتظار کرتے ہوئے لوگ گاڑی کی

کھڑکی اور دروازوں سے جھانک کر باہر دیکھنے والے لوگ اکثر ان ساڑھیوں کو ہوا میں جھولتا ہوا دیکھتے ہیں۔ وہ ان کے مختلف رنگ دیکھتے ہیں بھورا گہرا بھورا، مٹ میلا نیلا، قرمزی بھورا گندا سرخ، کنارا گہرا نیلا اور لال وہ لوگ اکثر انہیں رنگوں کو فضا میں پھیلے ہوئے دیکھتے ہیں ایک لمحے کے لیے دوسرے لمحے میں گاڑی پل کے نیچے سے گذر جاتی ہے۔

ان ساڑھیوں کے رنگ اب جاذب نظر نہیں رہے کسی زمانہ میں ممکن ہے جب یہ نئی نئی خریدی گئی ہوں، ان کے رنگ خوب صورت اور چمکتے ہوئے ہوں۔ مگر اب نہیں ہیں متواتر دھوئے جاتے سے ان کے رنگوں کی آب و تاب مر چکی ہے اور اب یہ ساڑھیاں اپنے پھیکے سیٹھے روزمرہ کے انداز کو بیے بڑی بے دلی سے جنگلی پر پڑی نظر آتی ہیں۔ آپ دن میں انہیں سو بار دیکھیں یہ آپ کو کبھی خوبصورت دکھائی نہ دیں گی نہ ان کا رنگ روپ اچھا ہے۔ نہ ان کا کپڑا۔ یہ بڑی سستی، گھٹیا قسم کی ساڑھیاں ہیں۔ ہر روز دھلنے سے ان کا کپڑا بھی تار تار ہو رہا ہے۔ ان میں کہیں کہیں روزن بھی نظر آتے ہیں کہیں اُدھڑے ہوئے ٹانکے ہیں، کہیں بدنما چتلے داغ جو اس قدر پائیدار ہیں کہ دھوئے جانے سے بھی نہیں دُھلتے بلکہ اور گہرے ہوتے جاتے ہیں۔ میں ان ساڑھیوں کی زندگیوں کو جانتا ہوں، کیونکہ میں ان لوگوں کو جانتا ہوں جو ان ساڑھیوں کو استعمال کرتے ہیں۔ یہ لوگ مہا لکشمی کے پل کے قریب ہی بائیں طرف آٹھ نمبر کی چال میں رہتے ہیں۔ یہ چالی متوالی نہیں ہے، بڑی غریب سی چال ہے۔ میں بھی اسی چال میں رہتا ہوں اس لیے آپ

کو ان ساڑھیوں اور ان کے پہننے والوں کے متعلق سب کچھ بتا سکتا ہوں، ابھی وزیراعظم کی گاڑی آتے میں بہت دیر ہے، آپ انتظار کرتے کرتے اُکتا جائیں گے اس لیے اگر آپ ان چھ ساڑھیوں کی زندگی کے بارے میں مجھ سے کچھ سُن لیں تو وقت آسانی سے کٹ جائے گا۔ ادھر یہ جو بھورے رنگ کی ساڑی لٹک رہی ہے وہ بھی آپ کو بھورے رنگ کی دکھائی دیتی ہوگی، مگر وہ تو گہرے بھورے رنگ کی ہے، آپ نہیں، میں اس کا گہرا بھورا رنگ دیکھ سکتا ہوں کیونکہ میں اسے اس وقت سے جانتا ہوں جب اس کا رنگ چمکتا ہوا گہرا بھورا تھا۔ اب اس دوسری ساڑی کا رنگ بھی ویسا ہی بھورا ہے جیسا شانتی بائی کی ساڑی کا، اور شاید آپ ان دونوں ساڑھیوں میں بڑی مشکل سے کوئی فرق محسوس کر سکیں میں بھی جب ان کے پہننے والوں کی زندگیوں کو دیکھتا ہوں، تو بہت کم فرق محسوس کرتا ہوں، مگر یہ پہلی ساڑھی جو بھورے رنگ کی ہے وہ شانتا بائی کی ساڑی ہے اور جو دوسری بھورے رنگ کی ساڑھی ہے اور جس کا گہرا بھورا رنگ صرف میری آنکھیں دیکھ سکتی ہیں وہ جیونا بائی کی ساڑھی ہے۔

شانتا بائی کی زندگی بھی اس کی ساڑھی کے رنگ کی طرح بھوری ہے شانتا بائی برتن مانجنے کا کام کرتی ہے اس کے تین بچے ہیں، ایک بڑی لڑکی ہے دو چھوٹے لڑکے ہیں، بڑی لڑکی کی عمر چھ سال کی ہوگی، سب سے چھوٹا لڑکا دو سال کا ہے شانتا بائی کا خاوند سیمن کے کپڑے کھاتے میں کام کرتا ہے اسے بہت جلد جانا ہوتا ہے اس لیے شانتا بائی اپنے خاوند کے لیے دوسرے دن کی دوپہر کا کھانا رات ہی کو پکا رکھتی ہے، کیونکہ صبح اُسے خود برتن صاف

کرنے کے لیے اور پانی ڈھونے کے لیے دوسرے گھروں میں جانا ہوتا
ہے اور اب وہ ساتھ میں اپنے چھ برس کی بچی کو بھی لے جاتی ہے اور دوپہر
کے قریب چالی میں واپس آتی ہے۔ واپس آ کے وہ نہاتی ہے اور اپنی ساڑی
دھوتی ہے اور سکھانے کے لیے پل کے جنگلے پر ڈال دیتی ہے اور پھر ایک
بے حد غلیظ اور پرانی دھوتی پہن کر کھانا پکانے لگ جاتی ہے شانتا بائی کے
گھر چولہا اسی وقت سلگ سکتا ہے جب دوسروں کے ہاں چولہے ٹھنڈے
ہو جائیں یعنی دوپہر کے دو بجے اور رات کو نو بجے۔ اِن اوقات کے اِدھر
اُدھر اُسے دونوں وقت گھر سے باہر برتن مانجھنے اور پانی ڈھونے کا کام
کرنا ہوتا ہے اب تو چھوٹی لڑکی بھی اس کا ہاتھ بٹاتی ہے، شانتا بائی برتن
صاف کرتی ہے۔ چھوٹی لڑکی برتن دھوتی جاتی ہے، دو تین بار ایسا بھی ہوا کہ
چھوٹی لڑکی کے ہاتھ سے چینی کے برتن گِر کر ٹوٹ گئے۔ اب میں جب کبھی چھوٹی
لڑکی کی آنکھیں سوجی ہوئی اور اس کے گال سرخ دیکھتا ہوں تو سمجھ جاتا ہوں
کہ کسی بڑے گھر میں چینی کے برتن ٹوٹے ہیں۔ اس دن شانتا بائی بھی میری
بات کا جواب نہیں دیتی، جلتی، بھنتی، بڑبڑاتی چولہا سلگانے میں مصروف
ہو جاتی ہے، چھوٹا لڑکا جو دو سال کا ہے دھوئیں سے اپنا دم گھٹتا دیکھ
کر چیختا ہے۔ تو شانتا بائی اُس کے چینی لیسے نازک رخساروں پر زور
زور کی چپتیں لگانے سے باز نہیں آتی اس پر بچہ اور زیادہ چیختا ہے، یوں
تو یہ دن بھر روتا رہتا ہے، کیونکہ اسے دودھ نہیں ملتا اور اسے اکثر بھوک
لگ جاتی ہے۔ اور دو سال کی عمر ہی میں اسے باجرے کی روٹی کھانا پڑتی ہے

اُسے اپنی ماں کا دودھ اپنے دوسرے بھائی بہن کی طرح صرف پہلے چھ سات ماہ نصیب ہوا وہ بھی بڑی مشکل سے۔ پھر یہ بھی خشک باجری اور ٹھنڈے پانی پر پلنے لگا۔ ہماری چال کے سارے بچے اسی خوراک پر پلتے ہیں۔ وہ دن بھر ننگے رہتے ہیں اور رات کو گدڑی اوڑھ کر سو جاتے ہیں سوتے ہیں بھی وہ بھوکے رہتے ہیں اور جاگتے ہیں بھی بھوکے رہتے ہیں۔ اور جب شانتا بائی کے خاوند کی طرح بڑے ہو جاتے ہیں تو دن بھر خشک باجری اور ٹھنڈا پانی پی پی کر کام کرتے جاتے ہیں اور ان کی بھوک بڑھتی جاتی ہے اور ہر وقت معدے کے اندر اور دل کے اندر اور دماغ کے اندر ایک بوجھل سی دھمک محسوس کرتے رہتے ہیں اور جب پگار ملتی ہے تو ان میں سے کئی ایک سیدھے تاڑی خانے کا رُخ کرتے ہیں۔ تاڑی پی کر چند گھنٹوں کے لیے یہ دھمک زائل ہو جاتی ہے، لیکن آدمی ہمیشہ تو تاڑی نہیں پی سکتا۔ ایک دن پیئے گا، دو دن پیئے گا، تیسرے دن کی تاڑی کے لیے پیسے کہاں سے لائے گا۔ آخر کھولی کا کرایہ دینا ہے راشن کا خرچہ ہے بھاجی ترکاری ہے، تیل اور نمک ہے بجلی اور پانی ہے شانتا بائی کی بھوری ساڑھی ہے جو چھٹے ساتویں ماہ تار تار ہو جاتی ہے۔ کبھی سات ماہ سے زیادہ نہیں چلتی۔ یہ مل والے بھی پانچ روپے چار آنے میں کیسی کھدی نکمی ساڑھی دیتے ہیں۔ اس کے کپڑے میں ذرا جان نہیں ہوتی۔ چھٹے ماہ سے جو تار تار ہونا شروع ہوتا ہے تو ساتویں ماہ بڑی مشکل سے سی کے، جوڑ کے گانٹھ کے، ٹانکے لگا کے کام دیتا ہے پھر وہی پانچ روپے چار آنے خرچ کرنا پڑتے ہیں اور وہی بھورے رنگ کی ساڑھی آ جاتی ہے۔ شانتا کو یہ رنگ بہت

پسند ہے اس لیے کہ یہ میلا بہت دیر میں ہوتا ہے اُسے گھروں میں جھاڑو
دینا ہوتی ہے۔ برتن صاف کرنے ہوتے ہیں۔ تیسری چوتھی منزل تک پانی ڈھونا
ہوتا ہے وہ بھورا رنگ نہیں پسند کرے گی تو کیا کھلتے ہوئے شوخ رنگ،
گلابی، بسنتی، نارنجی پسند کرے گی۔ وہ اتنی بے وقوف نہیں ہے، وہ تین
بچوں کی ماں ہے، لیکن کبھی اس نے یہ شوخ رنگ بھی دیکھے تھے، پہنے تھے،
انہیں اپنے دھڑکتے ہوئے دل کے ساتھ پیار کیا تھا جب وہ دھاروار میں
اپنے گاؤں میں تھی، جہاں اس نے بادلوں میں شوخ رنگوں والی دھنک دیکھی تھی،
جہاں میلوں میں اس نے شوخ رنگ ناچتے ہوئے دیکھے تھے، جہاں اس
کے باپ کے دھان کے کھیت تھے۔ ایسے شوخ ہرے ہرے رنگ کے کھیت
اور آنگن میں پیرو کا پیڑ جس کے ڈال ڈال سے وہ پیرو توڑ توڑ کے کھایا کرتی تھی
جانے اب پیروؤں میں وہ مزا ہی نہیں ہے۔ وہ شیرینی اور گھلاوٹ ہی نہیں ہے۔
وہ رنگ وہ چمک دمک کہاں چلی گئی۔ وہ سارے رنگ کیوں یک لخت
بھورے ہو گئے۔ شانتا بائی کبھی برتن مانجھتے مانجھتے کانپ جاتی، اپنی ساڑھی
دھوتے، اسے پل کے جنگلے پر لاکر ڈالتے ہوئے یہ سوچا کرتی ہے اور اس کی
بھوری ساڑھی سے پانی کے قطرے آنسوؤں کی طرح ریل کی پٹری پر بہتے جاتے
ہیں اور دور سے دیکھنے والے لوگ ایک بھورے رنگ کی بدصورت عورت
کو پل کے اوپر جنگلے پر ایک بھوری ساڑھی کو پھیلاتے ہوئے دیکھتے ہیں اور
بس وہ سرسے لمبی گاڑی پل کے نیچے سے گذر جاتی ہے۔
جیونا بائی کی ساڑھی جو شانتا بائی کی ساڑھی کے ساتھ لٹک رہی ہے گہرے

بھورے رنگ کی ہے۔ بظاہر اس کا رنگ شانتا بائی کی ساڑھی سے بھی پھیکا نظر آئے گا لیکن اگر آپ اسے غور سے دیکھیں گے تو اس پھیکے پن کے باوجود یہ آپ کو گہرے بھورے رنگ کی نظر آئے گی۔ یہ ساڑھی بھی پانچ روپے چار آنے کی ہے۔ اور بڑی ہی بوسیدہ ہے۔ دو ایک جگہ سے پھٹی ہوئی تھی لیکن اب وہاں پر ٹانکے لگ گئے ہیں، اور اتنی دور سے معلوم بھی ہوتے ہیں۔ ہاں آپ وہ بڑا ٹکڑا ضرور دیکھ سکتے ہیں جو گہرے نیلے رنگ کا ہے۔ اور اس ساڑھی کے بیچ میں جہاں سے یہ ساڑھی بہت پھٹ چکی تھی لگا یا گیا ہے۔ یہ ٹکڑا جیونا بائی کی اس پہلی ساڑھی کا ہے۔ اور اس دوسری ساڑھی کو مضبوط بنانے کے لیے استعمال کیا گیا ہے۔ جیونا بائی بیوہ ہے اس لیے وہ ہمیشہ پرانی چیزوں سے نئی چیزوں کو مضبوط بنانے کے ڈھنگ سوچا کرتی ہے۔ جیونا بائی اپنے اس خاوند کے لیے روتی رہتی ہے۔ جس نے ایک دن اسے نشے میں مار مار کر اس کی ایک آنکھ کانی کر دی تھی وہ اس لیے نشے میں تھا کہ وہ اسی روز مل سے نکالا گیا تھا بڈھا دھونڈو صوابِ مل میں کسی کام کا نہیں رہا تھا۔ گو وہ بہت تجربہ کار تھا لیکن اس کے ہاتھوں میں اتنی طاقت نہ رہی تھی کہ وہ جوان مزدوروں کا مقابلہ کر سکتا بلکہ وہ تو اب دن رات کھانسی میں مبتلا رہتے لگا تھا۔ کپاس کے ننھے ننھے ریشے اس کے پھیپھڑوں میں جا کے ایسے دھنس گئے تھے، جیسے چرخیوں اور انٹوں میں سوت کے چھوٹے چھوٹے مہین تاگے پھنس جاتے ہیں۔ جب برسات آتی تو یہ ننھے ننھے ریشے اسے دمے میں مبتلا کر دیتے اور جب برسات نہ ہوتی تو وہ دن بھر اور رات بھر کھانستا۔ ایک خشک اور مسلسل کھکھار گھر میں اور کارخانے میں جہاں وہ کام کرتا تھا، سنائی دیتی رہتی۔ مل کے

مالک نے اس کھانسی کی خطرناک گھنٹی کو سنا اور ڈھونڈھو کو مل سے نکال دیا۔ ڈھونڈھو اس کے چھ ماہ بعد مر گیا۔ جیوتا بائی کو اس کے مرنے کا بہت غم ہوا۔ کیا ہوا اگر غصہ میں آکے ایک دن اس نے جیونا کی آنکھ نکال دی۔ تیس سال کی شادی شدہ زندگی ایک لمحے کے غصہ پر قربان نہیں کی جا سکتی۔ اور اس کا غصہ سچا تھا۔ اگر مل مالک ڈھونڈو کو یوں بے قصور نوکری سے الگ نہ کرتا تو کیا جیونا کی آنکھ نکل سکتی تھی، ڈھونڈو ایسا نہ تھا، اسے اپنی بیکاری کا غم تھا، اپنی ۳۵ سالہ ملازمت سے برطرف ہونے کا رنج تھا اور سب سے بڑا رنج اس بات کا تھا کہ مل مالک نے چلتے وقت اسے ایک دھیلا بھی تو نہیں دیا۔ ۳۵ سال پہلے جیسے ڈھونڈو خالی ہاتھ مل میں کام کرنے کے لیے آیا تھا اسی طرح خالی ہاتھ واپس لوٹا، اور دروازے سے باہر نکلنے پر اور اپنا نمبری کارڈ پیچھے چھوڑ آنے پر اسے ایک دھچکا سا لگا۔ باہر آکے اسے ایسا معلوم ہوا جیسے ان ۳۵ سالوں میں کسی نے اس کا سارا رنگ، اس کا سارا خون، اس کا سارا رس چوس لیا ہو اور اسے بیکار سمجھ کے باہر کوڑے کرکٹ کے ڈھیر پر پھینک دیا۔ اور ڈھونڈو بڑی حیرت سے مل کے دروازے کو اور اس بڑی چمنی کو دیکھنے لگا جو بالکل اس کے سر پر ایک خوفناک دیو کی طرح آسمان سے لگی کھڑی تھی۔ یکایک ڈھونڈو نے غم اور غصہ سے اپنے ہاتھ ملے زمین پر زور سے تھوکا اور پھر تاڑی خانہ میں چلا گیا۔

لیکن جیونا کی ایک آنکھ جب بھی نہ جاتی۔ اگر اس کے پاس علاج کے لیے پیسے ہوتے۔ وہ آنکھ تو گل گل کر، سڑ سڑ کر، خیراتی ہسپتالوں میں ڈاکٹروں، کمپونڈروں اور نرسوں کی بد احتیاطی اور گالیوں اور لاپرائیوں کا شکار ہو گئی اور جب جیونا اچھی

ہوئی۔ تو ڈھونڈو بیمار پڑ گیا اور ایسا بیمار پڑا کہ پھر بستر سے نہ اٹھ سکا۔ ان دنوں میں جیونا اس کی دیکھ بھال کرتی تھی۔ شانتا بائی نے مدد کے طور پر اسے چند گھروں میں برتن مانجھنے کا کام دلوا دیا تھا۔ اور گو وہ اب بوڑھی تھی اور مشاقی اور صفائی سے برتنوں کو صاف نہ رکھ سکتی تھی۔ پھر بھی وہ آہستہ آہستہ رینگ رینگ کر اپنے کمزور ہاتھوں میں چھوٹی طاقت کے بودے سہارے پر جیسے تیسے کام کرتی رہی۔ خوبصورت لباس پہننے والی، خوشبودار تیل لگانے والی بیویوں کی گالیاں سنتی رہی اور کام کرتی رہی۔ کیونکہ اس کا ڈھونڈو بیمار تھا اور اسے اپنے آپ کو اور اپنے خاوند کو زندہ رکھنا تھا۔ لیکن ڈھونڈو زندہ نہ رہا، اور اب جیونا بائی اکیلی تھی۔ خیریت اس میں تھی کہ بالکل اکیلی تھی اور اب اسے صرف اپنا دھندا کرنا تھا۔ شادی کے دو سال بعد اس کے ہاں ایک لڑکی پیدا ہوئی، لیکن جب وہ جوان ہوئی تو کسی بدمعاش کے ساتھ بھاگ گئی۔ اور اس کا آج تک کسی کو پتہ نہ چلا کہ وہ کہاں ہے۔ پھر کسی نے بتایا اور پھر بعد میں بہت سے لوگوں نے بتایا کہ جیونا بھائی کی بیٹی فارس روڈ پر بھڑکیلا لباس پہنے بیٹھی ہے۔ لیکن جیونا کو یقین نہ آیا۔ اس نے اپنی ساری زندگی پانچ روپے چار آنے کی دھوتی پہننے میں بسر کر دی تھی اور اسے یقین تھا کہ اس کی لڑکی بھی ایسا کرے گی۔ وہ ایسا نہ کرے گی، اس کا اسے کبھی خیال بھی نہ آیا تھا۔ وہ کبھی فارس روڈ نہیں گئی کیونکہ اسے اس کا یقین تھا کہ اس کی بیٹی وہاں نہیں ہے۔ بھلا اس کی بیٹی وہاں کیوں جانے لگی۔ یہاں اپنی کھولی میں کیا نہیں تھا۔ پانچ روپے چار آنے والی دھوتی تھی باجرے کی روٹی تھی۔ ٹھنڈا پانی تھا۔ سوکھی حرت تھی۔ اور یہ سب کچھ چھوڑ کے وہ فارس روڈ کیوں جانے لگی۔ اسے تو کوئی بدمعاش اپنی محبت کا سبز باغ دکھا کے لے گیا تھا۔

کیونکہ عورت محبت کے لیے سب کچھ کرگزرتی ہے، خود وہ تیس سال پہلے اپنے ڈھونڈو کے لیے اپنے ماں باپ کا گھر چھوڑ کر یہیں چلی آئی تھی۔ جس دن ڈھونڈو مرا اور جب لوگ اس کی لاش کو جلانے کے لیے لیجانے لگے اور جیونا نے اپنی سیندور کی ڈبیہ اپنی میٹی کی انگیا پر انڈیل دی جو اس نے بڑی مدت سے ڈھونڈو کی نظروں سے چھپا کے رکھی تھی۔ عین اسی وقت ایک گدرائے ہوئے جسم کی بھاری عورت بڑا چمکیلا لباس پہنے اس سے آکے لپٹ گئی اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگی۔ اور اسے دیکھ کر یکایک جیونا کو یقین آگیا کہ جیسے اب سب کچھ مر گیا ہے اس کا پتی، اس کی بیٹی، اس کی عزت، جیسے وہ زندگی بھر روٹی نہیں غلاظت کھاتی رہی ہے۔ جیسے اس کے پاس کچھ نہیں تھا۔ شروع ہی سے کچھ نہیں تھا۔ پیدا ہونے سے پہلے ہی اس سے سب کچھ چھین لیا گیا تھا۔ اسے ننگا، بھوکا اور بے عزت کر دیا گیا تھا۔ اور جیونا کو اس ایک لمحہ میں احساس ہوا کہ وہ جگہ جہاں اس کا خاوند زندگی بھر کام کرتا رہا اور وہ جہاں اس کی آنکھ اندھی ہو گئی۔ اور وہ جگہ جہاں اس کی بیٹی اپنی دکان سجا کے بیٹھ گئی، ایک بہت بڑا اندھا کارخانہ ہے۔ جس میں کوئی ظالم جابر ہاتھ انسانی جسموں کو گنے کا رس نکالنے والی مشین میں ٹھونستا جاتا ہے اور دوسرے ہاتھ سے توڑ مروڑ کر دوسری طرف پھینکتا جاتا ہے، اور یکایک جیونا اپنی بیٹی کو دھکا دے کے الگ کھڑی ہو گئی اور چیخیں مار مار کر رونے لگی۔

تیسری ساڑھی کا رنگ مٹ میلا نیلا ہے، یعنی نیلا بھی ہے اور میلا بھی ہے اور مٹیالا بھی ہے۔ کچھ ایسا عجب سا رنگ ہے جو بار بار دھونے پر بھی نہیں نکھرتا بلکہ اور غلیظ ہوتا جاتا ہے۔ یہ میری بیوی کی ساڑھی ہے۔ میں فورٹ میں دھنو بھائی کی فرم

میں کلرکی کرتا ہوں، مجھے پینسٹھ روپلے تنخواہ ملتی ہے۔ سیٹون مل اور بجبر یا مل کے مزدوروں کو بھی یہی تنخواہ ملتی ہے۔ اس لیے میں بھی انہیں کے ساتھ آٹھ نمبر کے چال کی ایک کھولی میں رہتا ہوں، مگر میں مزدور نہیں ہوں، کلرک ہوں، میں فورٹ میں نوکر ہوں، میں دسویں پاس ہوں، میں ٹائپ کر سکتا ہوں، میں انگریزی میں لکھ سکتا ہوں، میں اپنے وزیراعظم کی تقریر جلسے میں سن کر سمجھ بھی لیتا ہوں۔ آج تھوڑی دیر میں اُن کی گاڑی مہالکشمی پر آئے گی، نہیں وہ ریس کورس نہیں جائیں گے۔ وہ سمندر کے کنارے ایک شاندار تقریر کریں گے۔ اس موقع پر لاکھوں آدمی جمع ہوں گے ان لاکھوں میں میں بھی ایک ہوں گا، میری بیوی کو اپنے وزیراعظم کی باتیں سننے کا بہت شوق ہے۔ مگر میں اسے اپنے ساتھ نہیں لے جا سکتا۔ کیونکہ ہمارے آٹھ بچے ہیں اور گھر میں ہر وقت پریشانی سی رہتی ہے۔ جب دیکھو کوئی نہ کوئی چیز کم ہو جاتی ہے راشن تو روز کم پڑ جاتا ہے۔ اب نل میں پانی بھی کم آتا ہے۔ رات کو سونے کے لیے جگہ بھی کم پڑتی ہے اور تنخواہ تو اس قدر کم پڑتی ہے کہ مہینہ میں صرف پندرہ دن چلتی ہے، باقی پندرہ دن سود خور پٹھان چلاتا ہے۔ اور وہ بھی کیسے، گالیاں بکتے جھکتے، گھسٹ گھسٹ کر کسی سست رفتار مال گاڑی کی طرح یہ زندگی چلتی ہے۔

میرے آٹھ بچے ہیں، مگر یہ اسکول میں نہیں پڑھ سکتے۔ میرے پاس انکی فیس کے پیسے کبھی نہ ہوں گے۔ پہلے پہل جب میں نے بیاہ کیا تھا اور ساوتری بھی بڑی اچھی اچھی باتیں سوچا کرتی تھی، گوبھی کے نازک نازک ہرے ہرے پتوں کی طرح پیاری پیاری باتیں، جب وہ مسکراتی تھی تو سینما کی تصویر کی طرح

خوبصورت دکھا کرتی تھی۔ اب وہ مسکراہٹ نہ جانے کہاں چلی گئی ہے۔ اس کی جگہ ایک مستقل تیوری نے لے لی ہے۔ وہ ذرا سی بات پر بچوں کو بے تحاشہ پیٹنا شروع کر دیتی ہے اور میں تو کچھ بھی کہوں۔ کیسے بھی کہوں، کتنی ہی لجاجت سے کہوں، وہ تو بس مجھے کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے۔ پتہ نہیں ساوتری کو کیا ہو گیا ہے۔ پتہ نہیں مجھے کیا ہو گیا ہے۔ میں دفتر میں سیٹھ کی گالیاں سنتا ہوں۔ گھر پہ بیوی کی گالیاں سنتا ہوں اور ہمیشہ خاموش رہتا ہوں کبھی کبھی سوچتا ہوں، شاید میری بیوی کو ایک نئی ساڑھی کی ضرورت ہے، شاید اسے ایک نئی ساڑھی ہی نہیں، ایک نئے جیون، ایک نئے گھر، ایک نئے ماحول، ایک نئی زندگی کی ضرورت ہے۔ مگر اب ان باتوں کو سوچنے سے کیا ہوتا ہے۔ اب تو آزادی آگئی ہے۔ اور ہمارے وزیراعظم نے یہ بھی کہہ دیا ہے کہ اس نسل کو، یعنی ہم لوگوں کو اپنی زندگی میں کوئی آرام نہیں مل سکتا۔ میں نے ساوتری کو اپنے وزیراعظم کی تقریر جو اخبار میں پڑھی تھی سنائی تو وہ اسے سن کر آگ بگولہ ہو گئی۔ اور اس نے غصہ میں آکے چولہے کے قریب پڑا ہوا چمٹا میرے سر میں دے مارا۔ یہ زخم کا نشان جو آپ میرے ماتھے پر دیکھ رہے ہیں، اسی کا نشان ہے۔ ساوتری کی مٹ میلی نیلی... ساڑھی پر بھی ایسے کئی زخموں کے نشان ہیں۔ مگر آپ انہیں نہیں دیکھ سکیں گے۔ میں دیکھ سکتا ہوں۔ ان میں سے ایک نشان تو اس مونگیا رنگ کی جارجیٹ کی ساڑھی کا ہے جو اس نے اوپیرا ہاؤس کے نزدیک بھنجی مل بھوندو رام پارچہ فروش کی دکان پر دیکھی تھی۔ ایک نشان اس کھلونے کا ہے جو

پچیس روپے کا تھا اور جسے دیکھ کر میرا پہلا بچہ خوشی سے کلکاریاں مارنے لگا، تھا لیکن جسے ہم خرید نہ سکے، اور جسے نہ پاکر میرا بچہ دن بھر روتا رہا، ایک نشان اس تار کا ہے جو ایک دن جبل پور سے آیا تھا جس میں ساوتری کی ماں کی شدید علالت کی خبر تھی۔ ساوتری جبل پور جانا چاہتی تھی۔ لیکن ہزار کوشش کے باوجود بھی مجھے ادھار پیسے نہ مل سکے تھے اور ساوتری جبلپور نہ جا سکی تھی۔ ایک نشان اس تار کا ہے۔ جس میں اس کی ماں کی موت کا ذکر تھا۔ ایک نشان ...... مگر میں کس کس نشان کا ذکر کروں، یہ نشان چیتھے چیتھے، گدے گدے غلیظ داغوں سے ساوتری کی پانچ روپے چار آنے والی ساڑھی سے دوسری ساڑھی میں منتقل ہوتے جائیں گے۔

یہ تھی ساڑھی قرمزی رنگ کی ہے اور قرمزی رنگ میں بھورا رنگ بھی جھلک رہا ہے۔ یوں تو یہ سب مختلف رنگوں والی ساڑھیاں ہیں، لیکن بھورا رنگ ان سب میں جھلکتا ہے۔ ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے ان سب کی زندگی ایک ہے۔ جیسے ان سب کی قیمت ایک ہے، جیسے یہ زمین سے کبھی اوپر نہیں اٹھیں گی۔ جیسے انہوں نے کبھی شبنم میں نہتی ہوئی دھنک، افق پر چمکتی ہوئی شفق بادلوں میں لہراتی ہوئی برق نہیں دیکھی۔ جیسے شانتا بائی کی جوانی ہے۔ وہ جیونتا کا بڑھاپا ہے، وہ ساوتری کا ادھیڑ پن ہے۔ جیسے یہ سب ساڑھیاں، زندگیاں، ایک رنگ، ایک سطح، ایک توازن، ایک مسلسل یکسانیت سے ہوئے ہوا میں جھولتی جاتی ہیں۔

یہ قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جیبو بھیئے کی عورت کی ہے، اس

عورت سے میری بیوی کبھی بات نہیں کرتی، کیونکہ ایک تو اس کے کوئی بچہ وچہ نہیں ہے۔ اور ایسی عورت جس کے کوئی بچہ نہ ہو بڑی نحس ہوتی ہے وہ جادو ٹونے کر کے دوسروں کے بچوں کو مار ڈالتی ہے۔ اور بد روحوں کو بلا کے اپنے گھر میں بسا لیتی ہے۔ میری بیوی اسے کبھی منہ نہیں لگاتی۔ یہ عورت جھبو بھیا نے خرید کر حاصل کی ہے۔ جھبو بھیا مراد آباد کا رہنے والا ہے۔ لیکن بچپن ہی سے اپنا دیس چھوڑ کے ادھر چلا آیا۔ وہ مراٹھی اور گجراتی زبان میں بڑے مزے سے گفتگو کر سکتا ہے۔ اسی وجہ سے اسے بہت جلد پوواریل کے گنی گھاتے میں جگہ مل گئی۔ جھبو بھیا کو شروع ہی سے بیاہ کا بہت شوق تھا۔ اسے بیڑی کا، تاڑی کا کسی چیز کا شوق نہیں تھا۔ شوق تھا تو صرف اس بات کا کہ اس کی شادی جلد سے جلد ہو جائے۔ جب اس کے پاس ستّر اسّی روپے اکٹھے ہو گئے تو اس نے اپنے دیس جانے کی ٹھانی تھا کہ وہاں اپنی برادری سے کسی کو بیاہ لائے۔ مگر پھر اس نے سوچا ان ستّر اسّی روپوں میں کیا ہوگا۔ آنے جانے کا کرایہ بھی بڑی مشکل سے ہوگا۔ چار سال کی محنت کے بعد اس نے یہ رقم جوڑی تھی۔ لیکن اس رقم سے وہ مراد آباد جا سکتا تھا۔ جا کے شادی نہیں کرا سکتا تھا۔ اس لیے جھبو بھیا نے یہیں ایک بدمعاش سے بات چیت کر کے اس عورت کو سَو روپے میں خرید لیا۔ اسّی روپے اس نے نقد دیئے۔ بیس روپے ادھار میں رہے جو اس نے ایک سال کے عرصے میں ادا کئے۔ بعد میں جھبو کو معلوم ہوا کہ یہ عورت بھی مراد آباد کی رہنے والی تھی۔ وہ صریح گاڑل کی اور اس کی برادری ہی کی تھی۔ جھبو بڑا خوش ہوا۔ چلو بیٹھے بیٹھے سب کام ہو گیا۔ اپنی حاجت پڑی

کی۔ اپنے ضلع کی۔ اپنے دہرم کی عورت یہیں بیٹھے بٹھائے سو روپے میں مل گئی
اس نے بڑے چل چلاؤ سے اپنا بیاہ رچایا۔ اور پھر اسے معلوم ہوا کہ اس کی بیوی
لڑیا بہت اچھا گاتی ہے۔ وہ خود بھی اپنی پاٹ دار آواز میں زور سے گانے بلکہ
گانے سے زیادہ چلانے کا شوقین تھا۔ اب تو کھولی میں دن رات گویا کسی نے
ریڈیو کھول دیا ہو۔ دن میں کھولی میں لڑیا کام کرتے ہوئے گاتی تھی رات کو
جھبو اور لڑیا دونوں کھاتے تھے۔ ان کے ہاں کوئی بچہ نہ تھا۔ اس لیے انہوں
نے ایک طوطا پال رکھا تھا۔ میاں مٹھو خاوند اور بیوی کو گاتے دیکھ دیکھ کر
خود بھی لہک لہک کر گانے لگے۔ لڑیا میں ایک اور بات بھی تھی۔ جھبو نہ بیڑی
پیتی، نہ سگرٹ، نہ تاڑی۔ لڑیا، بیڑی، سگرٹ اور تاڑی سب کچھ پیتی تھی،
کہتی تھی پہلے وہ سب کچھ نہیں جانتی تھی۔ مگر جب سے وہ بدمعاشوں کے
پلّے پڑی، اسے یہ سب بری باتیں سیکھنا پڑیں، اور اب وہ سب باتیں تو
چھوڑ سکتی ہے۔ مگر بیڑی اور تاڑی نہیں چھوڑ سکتی کئی بار تاڑی پی کر لڑیا
نے جھبو پہ حملہ کیا، اور جھبو نے اسے روئی کی طرح دھنک کر رکھ دیا۔ اس
موقع پر طوطا بہت شور مچاتا تھا۔ اور رات کو دونوں کو گالیاں بکتے دیکھ کر
خود بھی پنجرے میں ٹنگا ہوا زور زور سے چلا کر وہی گالیاں بکتا جو وہ دونوں
بکتے تھے، ایک بار تو اس کی گالی سن کر جھبو غصے میں آ کے طوطے کو
پنجرے سمیت بدرو میں پھینکنے لگا تھا مگر جیونا نے بیچ میں پڑ کر طوطے کو بچا
لیا۔ طوطے کو مارنا پاپ ہے، جیونا نے کہا، تمہیں براہمنوں کو بلا کے بڑا
کشٹ کرنا پڑے گا تمہارے پندرہ بیس روپے کھل جائیں گے، یہ سوچ

کر جھبو نے لوٹے کو بدلہ میں عزت کر دینے کا خیال ترک کر دیا۔

شروع شروع میں تو جھبو کو ایسی شادی . . . . پر چار دن طرف سے گالیاں پڑیں، وہ خود بھی لڑیا کو بڑی شبہہ کی نظروں سے دیکھتا رہا، اور کئی بار اسے بلا وجہ پیٹا اور خود بھی مل سے غیر حاضر رہ کر اس کی نگرانی کرتا رہا، مگر آہستہ آہستہ لڑیا نے اپنا اعتبار ساری چال میں قائم کر لیا، لڑیا کہتی تھی کہ کوئی عورت سچے دل سے بدمعاشوں کے پلے پڑنا پسند نہیں کرتی، وہ تو ایک گھر چاہتی ہے چاہے وہ چھوٹا ہی سا ہو، وہ ایک خاوند چاہتی ہے جو اس کا اپنا ہو، چاہے وہ چھوٹا بھیا ایسا ہر وقت شور مچانے والا زبان دراز، نکھٹو، ہی کیوں نہ ہو، وہ ایک ننھا بچہ چاہتی ہے چاہے وہ کتنا ہی بدصورت کیوں نہ ہو، اور اب لڑیا کے پاس گھر بھی تھا، اور جھبو بھی تھا اور اگر بچہ نہیں تھا تو کیا ہوا، ہو جائے گا، اور اگر نہیں ہوتا تو بھگوان کی مرضی یہ میاں مٹھو ہی اس کا بیٹا بنے گا۔

ایک روز لڑیا اپنے میاں مٹھو کا پنجرا اچھلا رہی تھی، اور اسے چوری کھلا رہی تھی، اور اپنے دل کے سپنوں میں ایسے بالک کو دیکھ رہی تھی جو فضا میں ہمکتا اس کی آغوش کی طرف بڑھتا چلا آ رہا تھا کہ چال میں شور بڑھنے لگا، اور اس نے دروازے سے جھانک کر دیکھا کہ چند مزدور جھبو کو اٹھائے چلے آ رہے تھے، اور ان کے کپڑے خون سے رنگے ہوئے ہیں لڑیا کا دل دھک سے رہ گیا، وہ بھاگتی بھاگتی نیچے گئی، اور اس نے بڑی دلاشتی سے اپنے خاوند کو مزدوروں سے چھین کے اپنے کندھے پر اٹھا لیا، اور اپنی کھولی میں لے آئی، پوچھنے پر پتہ چلا کہ جھبو سے گنی

کھاتے کے مینیجر نے کچھ ڈانٹ ڈپٹ کی۔ اس پر جھبو نے بھی اسے دو بات بڑھ دیں، اس پر بہت واویلا مچا اور مینیجر نے اپنے بدمعاشوں کو بلا کر جھبو کی خوب پٹائی کی اور اسے مل سے باہر نکال دیا۔ خیریت ہوئی کہ جھبو بچ گیا ورنہ اس کے مرنے میں کوئی کسر نہ تھی لڑیا نے بڑی ہمت سے کام لیا، اس نے اسی روز سے اپنے سر پر ٹوکری اٹھالی اور گلی گلی ترکاری بھاجی بیچنے لگی۔ جیسے وہ زندگی میں یہی دھندا کرتی آئی ہے۔ اس طرح محنت مزدوری کر کے اس نے اپنے جھبو کو اچھا کر لیا۔ جھبو اب بھلا چنگا ہے مگر اب اسے کسی مل میں کام نہیں ملتا، وہ دن بھر اپنی کھولی میں کھڑا مہالکشمی کے اسٹیشن کے چاروں طرف بلند و بالا کارخانوں کی چمنیوں کو تکتا رہتا ہے۔ سیؤن مل، نیو مل، اولڈ مل، پوار مل دھنراج مل لیکن اس کے لیے کسی مل میں جگہ نہیں ہے کیونکہ مزدور کو گالی کھانے کا حق ہے گالی دینے کا حق نہیں ہے آج کل لڑیا بازاروں اور گلیوں میں آوازیں دے کر بھاجی ترکاری فروخت کرتی ہے اور گھر کا سارا کام کاج بھی کرتی ہے۔ اس نے بیڑی، گاڑی سب چھوڑ دی ہے یہاں اس کی ساڑھی، قرمزی بھورے رنگ کی ساڑھی جگہ جگہ سے پھٹتی جا رہی ہے۔ تھوڑے دنوں تک اور اگر جھبو کو کام نہ ملا تو لڑیا کو اپنی ساڑھی میں پرانی ساڑھی کے ٹکڑے جوڑنا پڑیں گے۔ اور اپنے میاں مٹھو کو چوری کھلانا بند کرنا پڑے گا۔

پانچویں ساڑھی کا کنارہ گہرا نیلا ہے۔ ساڑھی کا رنگ گدلا سرخ ہے لیکن کنارہ گہرا نیلا ہے۔ اور اس نیلے میں اب بھی کہیں چمک باقی ہے۔ یہ ساڑھی

دوسری ساڑھیوں سے بڑھیا ہے۔ کیونکہ یہ ساڑھی پانچ روپے چار آنے کی نہیں ہے اس کا کپڑا، اس کی چمک دمک کہے دیتی ہے کہ یہ ان سے ذرا مختلف ہے۔ آپ کو دور سے یہ مختلف معلوم نہیں ہوتی ہوگی۔ مگر میں جانتا ہوں کہ یہ اُن سے ذرا مختلف ہے۔ اس کا کپڑا بہتر ہے۔ اس کا کنارا چمکدار ہے اس کی قیمت پونے نو روپے ہے۔ یہ ساڑھی منجولا کی ہے۔

یہ ساڑھی منجولا کے بیاہ کی ہے منجولا کے بیاہ کی ہے منجولا کے بیاہ کو ابھی چھ ماہ بھی نہیں ہوئے ہیں۔ اس کا خاوند گزشتہ ماہ چرخی کے گھومتے ہوئے پٹے کی لپیٹ میں آ کے مارا گیا تھا۔ اور اب سولہ برس کی خوب صورت منجولا بیوہ ہے۔ اس کا دل جوان ہے۔ اس کا جسم جوان ہے، اس کی امنگیں جوان ہیں۔ لیکن اب وہ کچھ نہیں کر سکتی۔ کیونکہ اس کا خاوند مل کے ایک حادثہ میں مر گیا ہے۔ وہ پٹہ بڑا ڈھیلا تھا اور گھومتے ہوئے بار بار پھٹپھٹاتا تھا، اور کام کرنے والوں کے احتجاج کے باوجود اسے مل مالکوں نے نہیں بدلا تھا کیونکہ کام چل رہا تھا۔ دوسری صورت میں تھوڑی دیر کے لیے کام بند کرنا پڑتا۔ پٹے کو تبدیل کرنے کے لیے روپیہ پیسہ بھی خرچ ہوتا تھا مزدور تو کسی وقت بھی تبدیل کیا جا سکتا ہے، اس کے لیے روپیہ تھوڑی خرچ ہوتا ہے لیکن پٹہ تو بڑی قیمتی شے ہے،

جب منجولا کا خاوند مارا گیا، تو منجولا نے ہرجانے کی درخواست دی جو نا منظور ہوئی، کیونکہ منجولا کا خاوند اپنی غفلت سے مرا تھا۔ اس لیے منجولا کو کوئی ہرجانہ نہ ملا۔ اور وہ اپنی وہی نئی دلہن کی ساڑھی پہنے رہی جو اس کے خاوند نے پونے نو روپے میں اس کے لیے خریدی تھی، کیونکہ اس کے پاس

کوئی دوسری ساڑھی نہ تھی جو وہ اپنے خاوند کی موت کے سوگ میں پہن سکتی۔ وہ اپنے خاوند کے مر جانے کے بعد بھی دلہن کا لباس پہننے پر مجبور تھی، کیونکہ اس کے پاس کوئی دوسری ساڑھی نہ تھی، اور جو ساڑھی تھی وہ یہی گدلے سرخ رنگ کی پونے تو روپے کی ساڑھی جس کا رنگ گہرا نیلا ہے۔

شاید اب منجولا بھی پانچ روپے چار آنے کی لاتی، اس لحاظ سے اس کی زندگی میں کوئی خاص فرق نہیں آیا، مگر فرق اتنا ضرور ہوا ہے کہ وہ یہ ساڑھی آج پہننا چاہتی ہے ایک سفید ساڑھی پانچ روپے چار آنے والی جسے پہن کر وہ دلہن نہیں بیوہ معلوم ہو سکے یہ ساڑھی اسے دن رات کاٹ کھانے کو دوڑتی ہے اس ساڑھی سے جیسے اس کے مرحوم خاوند کی مضبوط باہیں لپٹی ہیں، جیسے اس کے ہر تار پر اس کے شفاف بوسے مرقسم ہیں، جیسے اس کے تانے بانے میں اس کے خاوند کی گرم گرم سانسوں کی حدت آمیز غنودگی ہے اس کے سیاہ بالوں والی چھاتی کا سارا پیار دفن ہے۔ جیسے اب یہ ساڑھی نہیں ہے، اک گہری قبر ہے جس کی ہولناک پہنائیوں کو وہ ہر وقت اپنے جسم کے گرد لپیٹ لینے پر مجبور رہے۔ منجولا زندہ قبر میں گاڑی جا رہی ہے۔

چھٹی ساڑھی کا رنگ لال ہے، لیکن اسے یہاں نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ اسے پہننے والی مر چکی ہے، پھر بھی یہ ساڑھی یہاں جنگلے پر بدستور موجود ہے روز کی طرح دھلی دھلائی ہوا میں جھول رہی ہے یہ نائی کی ساڑھی ہے جو ہماری چال کے دروازے کے قریب اندر کھلے آنگن میں رہا کرتی تھی، مائی کا ایک بیٹا ہے۔ سیتو، وہ اب جیل میں ہے، رتن سیتو کی بیوی اور اس

سالہا کا یہیں نیچے آنگن میں دروازے کے قریب دیوار کے نیچے پڑا رہتا ہے۔ سیتو اور سیتو کی بیوی اور اس کی لڑکی اور بڑھیا مائی یہ سب لوگ ہماری چال کے بھنگی ہیں۔ ان کے لیے کھولی بھی نہیں ہے اور ان کے لیے اتنا کھانا کپڑا بھی نہیں ملتا جتنا ہم لوگ کو ملتا ہے، اس لیے یہ لوگ آنگن میں رہتے ہیں، وہیں کھانا کھاتے ہیں، وہیں پڑ کے سوتے ہیں یہیں یہ بڑھیا مائی ماری گئی تھی، وہ بڑا سوراخ جو آپ اس ساڑھی میں دیکھ رہے ہیں پلو کے قریب یہ گولی کا سوراخ ہے، یہ سالار توس کی گولی مائی کو بھنگیوں کے ہڑتال کے دنوں میں لگی تھی، نہیں وہ اس ہڑتال میں حصہ نہیں لے رہی تھی، وہ بیچاری تو بہت بوڑھی تھی، چل پھر نہیں سکتی تھی، اس ہڑتال میں تو اس کا بیٹا سیتو اور دوسرے بھنگی شامل تھے، یہ لوگ مہنگائی مانگتے تھے۔ اور کھولی کا کرایہ مانگتے تھے۔ یعنی اپنی زندگی کے لیے دو وقت کا روٹی کپڑا، اور سر پر ایک چھت چاہتے تھے، اس لیے ان لوگوں نے ہڑتال کی تھی اور جب ہڑتال خلاف قانون دیدی گئی تو ان لوگوں نے جلوس نکالا اور اس جلوس میں مائی کا بیٹا سیتو آگے آگے تھا اور خوب زور و شور سے نعرے لگاتا تھا اور پھر جب جلوس بھی خلافِ قانون قرار دے دیا گیا تو گولی چلی اور ہماری چال کے سامنے چلی، ہم لوگوں نے اپنے دروازے بند کر لیے لیکن گھبراہٹ میں چال کا دروازہ بند کرنا کسی کو یاد نہ رہا اور پھر ہم اپنے بند کمروں میں ایسا معلوم ہوا گویا گولی اِدھر سے اُدھر سے چاروں طرف سے چل رہی ہو، تھوڑی دیر کے بعد بالکل سناٹا ہو گیا اور جب ہم لوگوں نے ڈرتے ڈرتے دروازہ کھولا اور باہر جھانک کے دیکھا تو جلوس تتر بتر ہو چکا تھا۔

اور ہماری چال کے دروازے کے قریب بڑھیا مری پڑی تھی، یہ اسی بڑھیا کی لال ساڑھی ہے، جس کا بیٹا سیتو اب جیل میں ہے اس لال ساڑھی کو اب بڑھیا کی بہو پہنتی ہے۔ اس ساڑھی کو بڑھیا کے ساتھ جلا دینا چاہیے تھا، مگر کیا کیا جائے تن ڈھکنا زیادہ ضروری ہے، مردوں کی عزت واحترام سے بھی کہیں زیادہ ضروری ہے کہ زندوں کا تن ڈھکا جائے، یہ ساڑھی جلنے جلانے کے لیے نہیں ہے، تن ڈھکنے کے لیے ہے، ہاں کبھی کبھی سیتو کی بیوی اس کے پلو سے اپنے آنسو پونچھ لیتی ہے، کیونکہ اس میں پچھلے اسی برسوں کے سارے آنسو اور ساری اُمنگیں اور ساری محنتیں اور شکستیں جذب ہیں۔ آنسو پونچھ کر سیتو کی بیوی پھر اِسی ہمت سے کام کرنے لگتی ہے جیسے کچھ ہوا ہی نہیں، کہیں گولی نہیں چلی کوئی جیل نہیں گیا، بھنگن کی جھاڑو اسی طرح چل رہی ہے،

ایو، باتوں باتوں میں وزیرِ اعظم صاحب کی گاڑی نکل گئی۔ وہ یہاں نہیں ٹھہری میں سمجھتا تھا وہ یہاں ضرور ٹھہرے گی، وزیرِ اعظم صاحب درشن دینے کے لیے گاڑی سے نکل کر تھوڑی دیر کے لیے پلیٹ فارم پر ٹہلیں گے اور شاید دُھوا میں جھولتی ہوئی ان چھ ساڑھیوں کو بھی دیکھ لیں گے جو مہا لکشمی کے پل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں۔ یہ چھ ساڑھیاں جو بہت ہی معمولی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں ایسی معمولی عورتیں جن سے ہمارے دیس کے چھوٹے چھوٹے گھر بنتے ہیں جہاں ایک کونہ میں چولہا سلگتا ہے، ایک کونے میں پانی کا گھڑا رکھا ہے، ادھر طاقچے میں شیشہ ہے کنگھی ہے، سیندور کی ڈبیہ ہے، کھاٹ پر ننھا بچہ سو رہا ہے، اُلگنی پر کپڑے سوکھ رہے ہیں۔ یہ اُن چھوٹے

چھوٹے لاکھوں کروڑوں گھروں کی نانے والی عورتوں کی ساڑھیاں ہیں جنہیں ہم ہندوستان کہتے ہیں۔ یہ عورتیں جو ہمارے پیارے پیارے بچوّں کی مائیں ہیں ہمارے بھولے بھالے بھائیوں کی عزیز بہنیں ہیں۔ ہماری معصوم محبتوں کا گیت ہیں ہماری پانچ ہزار سالہ تہذیب کا سب سے اونچا نشان ہیں۔ وزیر اعظم صاحب! یہ بھولی بھالی سیدھی سادی ساڑھیاں تم سے کچھ کہنا چاہتی ہیں تم سے کچھ مانگتی ہیں۔ کوئی بہت بڑی قیمتی چیز تم سے نہیں مانگتی ہیں۔ یہ کوئی بڑا الک، کوئی بڑا عہدہ کوئی بڑی موٹر کار، کوئی پرمٹ، کوئی ٹھیکہ، کوئی پراپرٹی۔ ایسی کسی چیز کی تم سے طالب نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی کی بہت ہی چھوٹی چھوٹی چیزیں مانگتی ہیں، دیکھئے! یہ شانتا بائی کی ساڑھی ہے جو اپنے بچپن کی کھوئی ہوئی دھنک تم سے مانگتی ہے۔ یہ جینا بائی کی ساڑھی ہے، جو اپنی آنکھ کی روشنی اور اپنی بیٹی کی عزت مانگتی ہے۔ یہ ساوتری کی ساڑھی ہے جس کے گیت مر چکے ہیں، اور جس کے پاس اپنے بچوں کے لیے اسکول کی فیس نہیں ہے۔ یہ لڑیا ہے، جس کا خاوند بے کار ہے اور جس کے کمرے میں ایک طوطا ہے، جو دو دن سے بھوکا ہے۔ یہ نئی دلہن کی ساڑھی ہے۔ جس کے خاوند کی زندگی چمڑے کے پٹے سے بھی کم قیمتی ہے یہ بڑی بھنگن کی لال ساڑھی ہے جو بندوق کی گولی کو پھول کی پھول میں تبدیل کرنا چاہتی ہے تاکہ دھرتی سے انسان کا لہو پھول بن کر کھل اٹھے اور گندم کے سنہرے خوشے ہنس کر لہرانے لگیں۔

لیکن وزیر اعظم صاحب کی گاڑی نہیں رکی اور وہ ان چھ ساڑھیوں کو نہیں دیکھ سکے۔ اور تقریر کرنے کے لیے چوپاٹی چلے گئے۔ اس لیے اب میں آپ

سے کہتا ہوں کہ اگر کبھی آپ کی گاڑی اُدھر سے گزرے تو آپ ان چھ ساڑھیوں کو ضرور دیکھئے جو مہالکشمی کے پل کے بائیں طرف لٹک رہی ہیں اور پھر آپ ان رنگا رنگ ریشمی ساڑھیوں کو بھی دیکھئے جنہیں دھوبیوں نے اسی پُل کے دائیں طرف سوکھنے کے لئے لٹکا دکھا ہے۔ اور جو ان گھروں سے آئی ہیں جہاں اونچی اونچی چمنیوں والے کارخانوں کے مالک یا اونچی اونچی تنخواہوں کے پانے والے رہتے ہیں۔ آپ اس پل کے دائیں بائیں دونوں طرف ضرور دیکھئے اور پھر اپنے آپ سے پوچھئے کہ آپ کس طرف جانا چاہتے ہیں۔ دیکھئے! میں آپ سے اشترا کی بننے کے لیے نہیں کہہ رہا ہوں۔ میں آپ کو جماعتی جنگ کی تلقین بھی نہیں کر رہا ہوں میں صرف یہ جاننا چاہتا ہوں کہ آپ مہالکشمی پل کے دائیں طرف ہیں یا بائیں طرف۔

مچھلی جال

گاؤں سویا ہوا تھا. بھورے بھورے مچھلی جال دھوپ میں سوکھنے کے لیے لکڑی کی اونچی کھپچیوں پر تنے ہوئے تھے، اور ان کی شطرنجی سلائے میں بڈھے ماہی گیر سو رہے تھے، ساحل کی ریت میں آدھے سے زیادہ اندر دھنسا ہوا سفید شوالہ اپنے کلس پر سفید جھنڈا لہرا رہا تھا، اونچے ٹیلے پر ناریل کا درخت تھا. جہاں ایک گدھا چپ چاپ کھڑا تھا، اس سے پرے باڑھ تھی جس کے اندر ناریل کا جھنڈ تھا، جو دور تک اندر گاؤں میں چلا گیا تھا، اور جس نے ماہی گیروں کے چھپروں کو نظر سے اوجھل کر دیا تھا،

یہاں ساحل کے کنارے کی ریت کس قدر خشک اور نرم تھی. ساحل سے جتنا دور جاؤ، ریت گرم اور سخت ہوتی جاتی تھی، اور ٹیلوں کے کنارے جہاں سمندری جھاگ سوکھ گیا تھا اور چھوٹی چھوٹی مہین سیپوں اور سنکھوں کی قطار لگی ہوتی تھی، وہاں کی ریت پر پاؤں رکھتے سے تلے کا پنجہ کے ٹوٹنے کی آواز پیدا ہوتی تھی، اور پاؤں ایک عجیب گدگدا دینے والی کرکری لذت سے آشنا ہوتے تھے، رگل دیر تک ان ٹیلوں کے کنارے چلتا رہا. اور اس لذت کے مزے لیتا رہا. اور بے فکری سے چاروں طرف دیکھتا رہا. اور چلتے چلتے

بیچ بیچ میں رک رک کر خوبصورت سیپیاں، گھونگھے اور سنکھ جمع کرتا رہا۔ ساحل ایک نیم دائرے کی صورت میں بہت دور تک پھیلا ہوا تھا۔ اس نیم دائرے کے سرے پر یہ گاؤں تھا، دوسرے سرے پر اس کا اپنا گاؤں، بیچ میں یہ لمبا کٹا پھٹا ساحل تھا۔ اور اونچے اونچے ٹیلوں سے بھرا ہوا، گل چلتے چلتے یکا یک ٹھٹک گیا، ایک بڑے ٹیلے کی اوٹ میں ایک کشتی اوندھے منہ پڑی تھی، اور اس کے قریب ایک لڑکی اوندھے منہ لیٹی تھی، گل نے اسے سر سے پاؤں تک دیکھا۔ اس نے اس لڑکی کے ننھے ننھے پاؤں سرخ مہندی میں رچے ہوئے دیکھے۔ اس نے اس کے سیاہ ابرق کی طرح چمکتے ہوئے جوڑے میں گل شفق کا ایک بہت بڑا پھول دیکھا جس کی رنگت بالکل سونے کی طرح تھی، ایک ہات ٹھوڑی کے نیچے تھا، دوسرا ہات ساحل کی ریت پر پڑا تھا، گل نے اس ہات کی چوڑیاں گنیں، گہرے سرخ کانچ کی سات چوڑیاں تھیں لیکن اب کے اسے یہ ہات بہت خوب صورت معلوم ہوا، اس نے یہ ہات دیکھا، رخساروں پر سوئی ہوئی پلکوں کی آراستہ صف کو دیکھا۔ ان ننھے ننھے نتھنوں کو دیکھا سانس کی لہروں سے باریک سیپوں کی طرح ہل رہے تھے، اور پھر اس ہات کو دیکھا جو اس کی طرف پھیلا ہوا ساحل کی ریت پر پڑا تھا۔ اور جس کی کلائی میں سات چوڑیاں تھیں، اور وہ وہیں ریت میں قریب بیٹھ گیا اور کانچ کی . چوڑیاں کو الگ الگ کرنے لگا،

"ہٹو مجھے سونے دو" لڑکی نے اسی طرح لیٹے لیٹے ہلے جلے بغیر کہا۔ اور گل ایک لمحے کے لیے چونک کر اچھل پڑا۔ اس کا خیال تھا کہ لڑکی سو رہی

ہے۔ لڑکی نے پھر کہا "تم کب کے یہاں کھڑے ہو" میں نے سوچا تم آپ چلے جاؤ گے مجھے دیکھ کر اب تو چلے جاؤ مجھے نیند آ رہی ہے۔ دیکھو کتنی اچھی دھوپ ہے اُف۔۔۔ اُف۔۔۔ اُم" لڑکی نے اب اپنے بازو ریت پر پھیلا دیئے اور اپنی طرف سے خوب جم کر سو گئی۔

گل نے اس کے جوڑے میں سجے ہوئے سنہرے پھول کو دیکھا اور پھر کانچ کی چوڑیاں گننے لگا۔ جب پوری سات گن چکا۔ تو اس نے آہستہ سے اس کے جوڑے سے وہ پھول نکال لیا۔

وہ لڑکی پھر اسی طرح لیٹے لیٹے بولی "تم ابھی تک نہیں گئے؟"

گل نے کہا "میں تمہارے لیے شفق کا پھول لایا ہوں، دیکھو"

لڑکی چونک کر اٹھ بیٹھی بے اختیار اس کا ہات اپنے جوڑے پر گیا۔ گل کا خیال ٹھیک نکلا۔ لڑکی بہت خوب صورت تھی۔

لڑکی نے کہا "لاؤ میرا پھول مجھے دے دو"

گل نے پھول آگے بڑھایا۔

لڑکی نے ہات آگے بڑھایا۔

گل نے پھول پیچھے ہٹا کے کہا "اُھوں۔ ایسے نہیں۔ میں اسے خود تمہارے جوڑے میں لگاؤں گا۔"

"نہیں" لڑکی نے بڑی سختی سے کہا۔

"نہیں؟ تو اچھا میں چلتا ہوں، خدا حافظ"

گل پھول اپنے ہات میں لیے دو قدم چلا، لڑکی نے کہا۔ اچھا آ جاؤ۔

وہ اپنے جوڑے میں پھول گھونسنے کے لیے ایک بت کی طرح اکڑ کر بیٹھ گئی اس سے اس کے سینے کا ابھار اور بھی تن گیا، اور کمر کا خم اور بھی نمایاں ہو گیا۔ اور گل نے سوچا، اس لڑکی کا نام مزور پوچھنا چاہیے۔ اس نے جوڑے میں پھول لگاتے ہوئے کہا، "تمہارا نام کیا ہے؟"

"ہم نہیں جانتے۔۔۔" لڑکی نے کہا۔

"کیوں نہیں جانتے؟"

"میں نہیں بتاؤں گی۔"

"کیوں نہیں بتاؤ گی؟"

لڑکی نے غصے سے ہات اپنے سینے پر رکھ لیے اور کہا "اب تم چلے جاؤ، سامنے ٹیلے پر میرا گاؤں ہے۔ ابھی شور مچاؤں گی، تو اتنے لوگ جمع ہو جائیں گے کہ تمہارے جسم پر گوشت کا ایک ٹکا بھی نہیں بچے گا۔ یہ تمہارا جسم جو اس وقت سمندری مچھلی کی طرح پلا ہوا دکھائی دے رہا ہے۔ اس میں صرف مچھلی کا کانٹا رہ جائے گا۔"

پھول جوڑے میں سج گیا۔

لڑکی نے ہنس کر کہا۔ "مگر مجھے یہ بھی تو معلوم نہیں کہ تمہارے اندر وہ مچھلی کا کانٹا بھی ہے کہ نہیں۔ بغیر کانٹے کے بھی تو مچھلیاں ہوتی ہیں نا؟"

گل نے یکایک اسے اپنے مضبوط بازوؤں کی گرفت میں لے لیا۔ لڑکی تڑپ کر اچھلی اور اس کا ہات زور سے گل کے رخسار پر پڑا۔ گل نے فوراً ایک ہات لڑکی کے منہ پر رکھ دیا اور وہ دونوں لڑتے گئے۔ لڑکی اس کی

گرفت سے آزاد ہونا چاہتی تھی ، اور وہ زور زور سے چلانا چاہتی تھی ، مگر گل کی گرفت بڑی مضبوط تھی ، اور اس کا دوسرا ہات بڑی سختی سے اس کے منہ پر جما ہوا تھا ، گل کو معلوم تھا کہ اس نے لڑکی کو چیخ کا موقعہ دیا تو اس کی خیر نہیں یکایک اسے معلوم ہوا کہ لڑکی اس کی گرفت سے نکلی جا رہی ہے وہ ، دونوں بانہوں سے لڑ رہی تھی ، اور گل صرف ایک بازو سے کام لے رہا تھا ، اور وہ دونوں لوٹتے پوٹتے بالکل کشتی کے قریب چلے گئے ۔ لڑکی نے کوشش کر کے دونوں ہاتھوں سے گل کا ایک ہات پیچھے مروڑ لیا ۔ اب ایک طرف کشتی تھی ، گل ادھر مڑ نہ سکتا تھا ۔ دوسری طرف ٹیلہ تھا ، بیچ میں گل پھنس گیا تھا ، لڑکی نے کوشش کر کے اپنا منہ پرے ہٹا لیا ، بولی " اب بتاؤ ۔" اس نے گل کے منہ پر دو گھونسے دئے ، گل تڑپ کر اپنے مروڑے ہوئے ہات پر زور دے کر جو اٹھا تو اسے کشتی کی کیل چبھ گئی تھی ، مگر اس نے ہنس کر کروٹ بدل ڈالی ۔ اب لڑکی ریت پر گر گئی ۔ اور اس نے دونوں بازو گل کی گرفت میں تھے اور گل نے اپنے ہونٹوں کو اس کے ہونٹوں کے بالکل قریب لے جا کے کہا ۔ " اب کہو "

لڑکی کے ہونٹ یوں پھڑک رہے تھے جیسے مچھلی بہت پتلے پانی میں ہانپتی ہے ۔ اس نے اپنے ہونٹ اس کے ہونٹوں سے ملا دیئے ایک بار دو بار پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے مچھلی بہت گہرے پانیوں میں پہنچ گئے ، جہاں بالکل سکون ہے اور امن ہے اور چین ہے اور وہ دونوں گہرے سبز پانیوں میں ایک دوسرے سے جل پریوں کی طرح لپٹے ہوئے آنکھیں بند کئے ہونٹ سے ہونٹ

ملائے تیرتے چلے جا رہے ہیں اور ان کے ارد گرد خوب صورت طلائی مچھلیاں گھوم رہی ہیں۔ اور مونگے کی خوشنما آبی جزیروں میں اسفنج حیرت سے اپنی آنکھیں کھولے ان کی طرف تک رہے ہیں اور نانکے پھر یرے آبی پودوں کی ریشمی ڈالیاں آہستہ آہستہ مسرت سے ہل رہی ہیں اور ان کے جسم آپ ہی آپ ڈولتے ہوئے سبز و سیاہ پتوں کے جھوے میں چھلتے ہوئے ریشمی ڈالیوں کو چھوتے ہوئے تیرتے ہوئے ان خوش رنگ محلوں کی طرف جا رہے ہیں جہاں سیپوں میں خوب صورت موتی رہتے ہیں، اور رنگا رنگ کے گھونگے اور سنکھ اپنے مرمریں دروازوں سے باہر جھانک کر دیکھتے ہیں جن کے دو رویہ پر کہیں سمندر کے دور شندان سے نیلی نیلی مدھم مدھم شعاعیں جھلمل جھلمل کرتی ہوئی آ رہی ہیں۔

لڑکی نے ایک گہرا سانس لیا اور اس کے ہاتھ کی مٹھیاں آپ ہی آپ کھلتی گئیں۔

گل نے آہستہ سے پوچھا "تمہارا نام کیا ہے"؟

"مہر" لڑکی نے بڑی کمزور آواز میں جواب دیا۔

"میرا نام گل ہے"، اس نے آہستہ سے کہا۔

گل ہے۔۔۔ گل! ۔۔۔ لڑکی کے کانپتے ہوئے ہونٹ کہنے لگے ۔۔۔ گل مہر۔

"نہیں۔ مہر گل، گل نے جواب دیا اور لڑکی کو سہارا دے کر اٹھایا

لڑکی بولی "تم کیا کرتے ہو، کہاں رہتے ہو"

گل نے کہا "میں وہ سامنے کے گاؤں میں رہتا ہوں اور مچھیرا ہوں۔

کرتا ہوں :

"معیر کیا ہوتا ہے"

گل نے کہا معیرا ایک قسم کی شراب ہوتی ہے۔ بالکل ایسی جیسے تمہارے ہونٹوں میں ہوتی ہے۔ نرم، گرم، پاکیزہ، لطف میٹھی میٹھی چاشنی لیئے ۔۔۔۔"

مہر نے کہا ۔۔۔ اگر تم نے کوئی شرارت کی تو میں واقعی گاؤں والوں کو بلا لوں گی"

گل ہنسا کہنے لگا : میں سب جانتا ہوں، گاؤں والے ہیں کہاں وہ سب مچھلی پکڑنے گئے ہیں :

مہر نے کہا "تم معیرا کیوں بناتے ہو۔ مچھلیاں کیوں نہیں پکڑتے :

گل نے کہا میں معیرا تیار کرتا ہوں، ماہی گیر مچھلیاں پکڑتے ہیں، اور پھر ایک ہی جگہ دستر خوان پر یہ دونوں چیزیں اکٹھی ہو جاتی ہیں۔ مچھلی اور معیرا ۔۔۔ گل اور مہر ۔۔۔

مہر ذرا پرے سرک گئی۔ بولی دیکھو میں تم سے کہتی ہوں، میرے قریب مت آؤ، تم نہیں جانتے میں کتنی خطرناک لڑکی ہوں۔

گل نے پوچھا کتنی خطرناک ہو؟

مہر نے کہا، میرے لیے تین خون ہو چکے ہیں۔ اب تک۔

گل نے کہا۔ تو اب چوتھے کی تیاری سمجھو۔

مہر نے کہا۔ لوگ کہتے ہیں کہ میں دنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہوں

گل نے کہا۔ ہر گاؤں میں ایک ایسی لڑکی ہوتی ہے جو دُنیا کی سب سے خوب صورت لڑکی ہوتی ہے۔ اور ہر لڑکی جب پہلی بار انگڑائی لیتی ہے دنیا کی سب سے خوبصورت لڑکی بن جاتی ہے۔ لیکن خوب صورتی میں میری محبوبہ کا جواب نہیں ہے۔

، کون ہے وہ ، مہر نے آنکھیں جھپکا کے پوچھا۔

، معصیرا ، گل نے ہنستے ہوئے کہا۔

مہر نے کہا۔ تمہارا کام اچھا نہیں ہے اسے چھوڑ دو۔

تو کیا کروں؟

مچھلیاں پکڑا کرو۔

گل نے مہر کی کمر میں ہاتھ ڈال دیا۔

مہر نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا "کیا کر رہے ہو"!

"مچھلی پکڑ رہا ہوں" گل نے جواب دیا۔

مہر ہنستے گئی۔ ہنستے ہنستے بولی۔ میں کس آفت میں پھنس گئی، میرا منگیتر اس وقت مجھے دیکھ لے تو جان سے مار ڈالے۔

تمہارا منگیتر بھی ہے؟

ہاں۔ اس کا نام عبدل ہے

عبدل کیا بہت خوفناک آدمی ہے۔

ہاں سارے گاؤں میں اس جیسا تگڑا جوان نہیں ہے۔۔۔ گر مہر نے گل کی طرف دیکھتے ہوئے کہا بڑے رشک سے کہا۔ وہ تمہاری طرح خوب

ضرورت نہیں ہے اور اتنا کہہ کر مہر نے گل کے سر میں بہت ساری ریت ڈال دی۔ گل اپنے بالوں کو جھٹک کر کہنے لگا۔ میں عبدل سے ملنا چاہتا ہوں۔

مہر نے کہا۔ وہ تمہیں جان سے مار ڈالے گا۔

گل نے کہا۔ اسی لیے ملنا چاہتا ہوں۔

مہر نے کہا۔ میں جانتی ہوں تم اس سے ملے بغیر اب نہیں رہو گے اور پھر تمہاری لاش سمندر کے گہرے پانی میں مچھلیاں کھا جائیں گی۔

گل نے کوئی جواب نہیں دیا۔ اس نے اپنے پاؤں ریت میں گاڑ دیئے، اور گھونگھے اور خالی سیپیاں اکٹھی کر کے گھروندا بنانے لگا۔ پھر مہر نے بھی اپنے خالی پاؤں ریت میں ڈبو دیئے اور اپنا چھوٹا سا گھروندا بنانے لگی۔۔۔ گھروندا بنانے میں وہ بڑی مشتاق معلوم ہوتی تھی۔ بہت جلد اس نے ایک خوبصورت سا ریت کا محل تعمیر کر لیا۔ اس کی پتلی پتلی انگلیاں بڑی تیزی سے چل رہی تھیں۔ گل انھیں دیکھتا ہی رہ گیا اور اس کا اپنا گھروندا نامکمل رہ گیا۔ اور جب مہر کا گھروندا بن گیا تو اس نے بھی جلدی جلدی اپنے موٹے کھردرے بڑے بڑے ہاتھوں سے ایک بے ڈول اور بے ڈھنگا سا گھروندا تیار کیا جو خوبصورت محل کے بجائے ایک بدنما تاریک غار معلوم ہوتا تھا۔

مہر نے گل کے گھروندے کو لات مار کے کہا۔ اونہہ، یہ بھی کوئی گھروندا ہے گل کا گھروندا ڈھے گیا۔ اس نے مہر کے گھروندے کو لات مار دی اور کہا اونہہ یہ بہت اچھا ہے؟

مہر نے پھر گل کو بالوں سے پکڑ لیا اور بہت ساری ریت اس کے سر پہ ڈال

دی، اور ریت اس کے سر میں اس کے کانوں میں اس کی آنکھوں میں اس کے نتھنوں میں اس کے منہ میں چلی گئی اور اس نے اسی حالت میں بالوں کو ایک بار جھٹک کر مہر کو پکڑ لیا اب کے ان رسیلے ہونٹوں کا مزا ہی کچھ عجیب تھا رگ رگ میں نس نس میں ریت کے خوشگوار ذرّے اک عجیب گدگدی سی پیدا کر رہے تھے۔

یکایک دور سمندر کے پانیوں سے گانے کی آواز آئی۔ مہر نے پلٹ کے دیکھا ساحل کے نیم دائرے کے مغربی کونے پر ایک بادبان والی کشتی نمودار ہو چکی تھی، مہر نے کشتی پہچان کے کہا" عبدل آ گیا

گل کے بازو تن گئے، بولا۔ اچھا ہے۔

نہیں تم چلے جاؤ۔

نہیں!

دیکھو میں کہتی ہوں۔ اس وقت ٹھیک نہیں ہے۔ میں اب خون خرابا نہیں چاہتی۔

نہیں۔

مہر نے گل کی ٹھوڑی کو ہات لگا کے کہا۔ مہر آج تک کسی کی نہ ہو سکی۔ مگر آج سے وہ تمہاری ہو جائے گی۔

گل مہر کی طرف دیر تک دیکھتا رہا، بولا۔ سچ کہتی ہو؟

مہر نے کہا۔ دیکھ لینا۔ اب تم جاؤ۔

مہر نے کہا ٹھہرو.... ٹھہرو۔

رات کے سناٹے میں مہر کی آواز گونج گونج کر لوٹ گئی۔ اور پھر عبدل کا

گیت ابھر آیا یہ گیت اس مچھلی کا معلوم ہوتا تھا جس کے گلے میں غبی کا کانٹا پھنس جائے اور حلق سے نکلنے سے انکار کر دے ،

مہرو رونے لگی۔

گل نے کہا روتی کیوں ہو۔ وہ اپنے ساتھیوں میں رل گیا ہے آج چاندنی رات ہے۔ آج سارے گاؤں والے بیچ سمندر میں جا کے جال ڈالتے ہیں اور مچھلیاں پکڑتے ہیں، صبح وہ سب کے ساتھ آ جائے گا ، دیکھ لینا ۔

لیکن عبدل صبح کو سب کے ساتھ نہیں آیا۔ رات بھر وہ اپنے ساتھیوں کے ساتھ مچھلیاں پکڑتا رہا ، اور گیت گاتا رہا اور سب کو ہنساتا رہا۔ آج رات اس کے جال میں بہت سی مچھلیاں آئیں ، ڈھیروں کے ڈھیر ، ایسی موٹی تازی خوبصورت مچھلیاں ان ماہی گیروں نے بہت مدت کے بعد پکڑی تھیں ، وہ لوگ بہت خوش تھے صبح کے وقت سب لوگ لوٹنے لگے ، تو عبدل نے کہا میں ابھی دیر میں آؤں گا تم لوگ چلو ، عبدل نے اپنی مچھلیاں مہرو کے لئے بھجوا دیں ، یہ سب ایسے ویسے رہنا اس میں بھی کوئی عجیب بات نہ تھی ، جو کسی کو شک پڑتا۔ اور پھر وہ سب سے جدا ہو کے سمندر کے اس حصے کی طرف چلا گیا ، جہاں کہتے ہیں ، بڑے سے بڑے طوفان کے وقت بھی لہریں ساکن رہتی ہیں ، اور جس کے اندر مچھلیوں نے گھیرا باندھ کے کنول کا پھول بنا رکھا ہے ، ماہی گیر کبھی ادھر نہیں جاتے ، نہ انہوں نے کبھی اس مقام کو دیکھا ہے صرف اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ مغربی کنارے سے دو میل آگے بیچ سمندر میں وہ مقام ہے جہاں ساکن سمندر کے اندر ایک خوفناک بھنور ہے ، اور جس کے اندر مچھلیاں اک کنول کا پھول نما دائرہ بنائے

ہوئے گھومتی ہیں۔

عبدل چلا گیا۔ وہ صبح کو واپس نہیں آیا۔ وہ دوپہر کو بھی نہیں لوٹا شام کو اس کی لاش کنارے سے آ لگی۔ اور گاؤں والوں نے اُسے اٹھا کے اپنے قبرستان میں دفن کر دیا۔

ٹمپریچر

"موتیا بھاگ گئی!"

جس لمحہ رلشیاں کے مونہہ سے بیگم نے یہ الفاظ سنے تھے، اسی دم اس نے رائفل اٹھالی تھی، اور موتیا ہرنی کے تعاقب میں خود بھی ہرنی کی طرح قلانچیں بھرتی ہوئی قلعے کی چاردیواری سے باہر نکل گئی تھی، اور بادن سیڑھیاں نیچے اتر کر مشرق کی طرف نکل گئی تھی، جہاں اس کے باپ کے کھیت دور دور تک

پھیلے ہوئے تھے، اور کھیتوں کے کنارے کنارے پھل دار درختوں کے جھنڈ کھڑے تھے،

بیگم کے ہاتھ پاؤں لمبے لمبے سے تھے، وہ ایک قدآور لڑکی تھی، مگر موزونیت کے ساتھ اودی پھول دار سوسی کی قمیض اور شلوار کے ساتھ اس کا چمپئی چہرہ پھول کی طرح کھلا جارہا تھا، اور موتیوں کی طرح چھوٹے چھوٹے مہین منکوں سے گندھی سنہری چوٹی دوڑتی ہوئی بیگم کی پیٹھ پر ناچتی جارہی تھی، قلعے کے زینے سے اترتے ہوئے اس نے اپنا دوپٹہ کس کر کمر سے باندھ لیا تھا، اس کی ماں نے اسے جاتے دیکھا بھی تھا، مگر وہ پھر سر پھری لڑکی رکی نہیں، رائفل کو کندھے پر لٹکائے ہوئے وہ اسی وقت چل پڑی تھی، جب اس نے موتیا کے بھاگنے کی خبر سنی تھی،

موتیا کو بیگم اس وقت جنگل سے اٹھا لائی تھی جب موتیا ایک بچہ سا تھی، شاید اس کی ماں کو کسی شکاری نے مار ڈالا تھا اور ممکن تھا ہرنی کی اس بچی کو بھی کوئی باگھ، چیتا، بھالو یا شیر مار ڈالا اگر موقعے سے بیگم کو وہ نہ مل گئی ہوتی۔ بچپن سے اب تک بیگم نے ہی اس ہرنی کی پرورش کی تھی، وہ اس کی ساری اَدائیں جانتی تھی۔ اسے غصہ تھا تو اسی بات کا رسی کی گرفت ڈھیلی ہوتے ہی ہرنی نے جنگل کا رُخ کر لیا تھا۔ غصے کے دو گلابی دھبے ابھی تک بیگم کے گالوں پر چمک رہے تھے، کتنی ناشکری ہے یہ موتیا۔ سچ ہے جانور بہر طور جانور ہی رہتا ہے کتنا ہی اسے پیار کیوں نہ کرو، خیر کوئی بات نہیں وہ بھی بہر صورت اپنی ہرنی کو پکڑنے کی کوشش کرے گی۔ سامنے کے مشرقی کوہستان میں چھپے ہوئے بالا ساری کے جنگل سے اپنی موتیا کو ڈھونڈ نکالے گی، چاہے اسے اس کام میں رات ہی کیوں نہ ہو جائے۔ رائفل تو اس نے اپنی حفاظت کے لیے اٹھا لی تھی، ہرنی کو مارنے کے لیے نہیں کچھ بھی ہو جائے وہ موتیا پر ہاتھ نہیں اٹھا سکتی تھی۔ چلتے چلتے اس نے اپنی ماں سے یہ بول سُنے تھے، اری لڑکی کہاں جاتی ہے! میں کسی شکاری کو بھیج دیتی ہوں۔ مگر بیگم رکی نہیں یہ ہرنی اس نے خود پالی تھی، وہ خود ہی اُسے جنگل سے ڈھونڈ نکالے گی۔

بیگم اپنی ماں باپ کی اکلوتی بیٹی تھی بیگم کا باپ بلدیاں مسلم راجپوتوں کا سربراہ تھا۔ وہ بہت بڑا زمیں دار تھا۔ اس پہاڑی قصبے میں دو ہی بڑے زمیں دار تھے، اور راجپوتوں کے دو ہی بڑے قبیلے تھے، بلدیاں اور ہلدیاں۔ دونوں قبیلے کس سن یا صدی میں مسلمان ہوئے، یہ کسی کو یاد نہ تھا ہاں اپنی آن پر مر مٹنے کی

ریٹ دونوں قبیلوں میں پائی جاتی تھی۔ راجہ غضنفر علی خاں ہلدیالوں کا سربراہ تھا اور راجہ اللہ داد خاں ہلدیالوں کا سردار۔ راجگی تو ختم ہو چکی تھی، مگر دونوں کے قلعے ابھی تک باقی تھے۔ شرقی قلعہ راجہ غضنفر علی کا گھر تھا، اور غربی قلعہ اللہ داد خاں کا۔ اور دونوں قلعوں کے بیچ میں شرقاً غرباً گھاٹی در گھاٹی، ڈھلان در ڈھلان خنڈل نالے تک دونوں زمیں داروں کے کھیت نشیب کی طرف چلے جاتے تھے۔

دونوں زمیں داروں میں صدیوں پرانی دشمنی تھی۔ شاید مذہب بدلنے سے پہلے بھی دونوں قبیلے ایک دوسرے کے دشمن تھے۔ شاید کسی زمانے میں ان دونوں قلعوں سے گولہ باری بھی ہوتی ہوگی۔ یا راجپوت صفیں باندھ کر تلواریں سونت کر جنگ آزما ہوتے ہوں گے۔ انگریزوں کے زمانے میں وہ سب تو ختم ہو گیا، مگر زمیں داری باقی رہی۔ اکثر پانی پر جھگڑا ہوتا، یا پھل دار درختوں سے سیب، ناشپاتی، خوبانی وغیرہ کی چوری پر جھگڑا ہوتا۔ نفرت کو زندہ رکھنے کے لیے اکثر چھوٹے افسانے بھی گھڑ لیے جاتے۔ پیار، سکون و اطمینان میں کتنی بوریت ہے، اور نفرت کی دہکتی ہوئی آگ کو اپنے خون میں محسوس کرتے ہوئے کتنا مزا آتا ہے!

اپنے کھیتوں سے گزر کر بیگم ہلدیالوں کے کھیتوں کی ایک چوڑی سی مینڈھ پہ دوڑتے ہوئے اچھل کر ایک ٹہنی سے سیب توڑ کر کھاتے ہوئے بالاسار کے اوپر کے جنگل کی طرف بڑھنے لگی۔ ہلدیالوں کے کئی مزارعوں نے اسے اس طرح سیب توڑ کر کھاتے ہوئے دیکھا، مگر صرف تاؤ کھا کر رہ گئے، کچھ کہا نہیں۔ بیگم کو بھی اپنے دشمن کے درختوں سے پھل توڑ کر کھانے میں بڑا مزہ آتا تھا۔ اس کی اور ہلدیالوں کے سردار اد خاں کے بڑے بیٹے شیر علی خاں کی آپس کی نفرت کے چرچے ہر گھر میں ہوتے تھے۔

شبیر علی بے حد عمدہ شکاری اور نشانے باز تھا، مگر بیگم اس سے بھی بہتر نشانہ باز تھی۔ اپنے ماں باپ کی اکلوتی ہونے کی وجہ سے اس کی پرورش تقریباً لڑکے ہی کی طرح ہوئی تھی۔ اللہ داد نے ایک مرتبہ چاہا تھا کہ دونوں قبیلوں کی دشمنی ختم ہو جائے۔ اس لیے اس نے اپنے بڑے بیٹے کا پیغام غضنفر علی خاں کی اکلوتی بیٹی بیگم کے لیے بھیجا تھا مگر کہتے ہیں کہ شبیر علی کا نام سنتے ہی بیگم نے نفرت سے تھوک دیا تھا۔

شبیر علی اس واقعہ کو کبھی نہ بھلا سکے۔ ایک دفعہ بیگم نے شبیر علی کے دو کتے مار دیے جو غلطی سے اس کے قلعہ کی سیڑھیوں پر چڑھ آئے تھے بدلے میں ایک بار شبیر علی نے بیگم کی گھوڑی کی ٹانگ توڑ دی۔ دونوں قبیلوں کی رپٹیں پولیس میں ہوتی رہتی تھیں مگر اسی نفرت کے بغیر شاید اس بڑے سے گاؤں یا چھوٹے سے قصبے کے لوگوں کو جمائیاں آنے لگتیں۔ جس دن سے یہ نفرت نہ رہے گی اسی دن سے یہ زندگی کس کام کی۔ محبت کے تو چند لمحے ہی خوشگوار معلوم ہوتے ہیں ورنہ زندگی تو نفرت کے سہارے ہی کٹتی ہے۔ اتنی لمبی زندگی دائمی محبت کی مٹھاس سے پھیکی نہ ہو جائے گی؟ ..... بیگم نے چیڑ کے درخت کے اندر سے سوچا۔ وہ بلدیالوں کی بہو بن کر بلدیالوں کی ناک کٹا لیتی کیا؟ ہونہہ! کیا سمجھا ہے ان لوگوں نے ......

یہی سب کچھ سوچ کر غضنفر علی خاں نے باگچی قبیلے کے سردار رحمت علی خاں کے سپوت شبیر سے اپنی بیگم کی شادی کر دی۔ مگر شادی کے چھ مہینے بعد ہی شبیر اپنے کسی دشمن کے قتل کے الزام میں کپڑا گیا دو سال مقدمہ چلا۔ قتل ثابت ہو گیا۔ اور شبیر کو پھانسی دے دی گئی۔

مقدمے کے شروع ہوتے ہی بیگم اپنے باپ کے گھر چلی آئی اور پھر کبھی واپس نہیں گئی۔ دراصل اسے شادی شدہ زندگی پسند ہی نہ تھی۔ اچھا ہوا وہ حالات کے ہاتھوں جلد ہی اس جنجال سے نکل گئی۔ وہ تو جنگل میں شیرنی کی طرح تھی۔ اسے گھرداری سے کیا واسطہ؟ ٹھیک ہے آج کل مسلمان تو کیا ہندوؤں میں بھی بیوادوں کی شادی ہونے لگی ہے۔ مگر وہ تو راجپوت ہے اور وہ بھی بلدیاں راجپوت! — حالانکہ یہ خون بھی اب سچا نہ رہا تھا خود بھی بیگم کے چہرے کی ایرانی نفاست چغلی کھا رہی تھی۔ مگر بیگم اپنے حسن اور اس کی شائستگی سے زیادہ دلچسپی نہ رکھتی تھی کھیتوں میں مزارعوں کے سر پر کھڑے ہو کر انہیں ڈانٹنا، لڑکیوں کی فوج بنا کر انہیں ٹریننگ کرانا، کبھی کبھی اپنے قلعہ کی ٹوٹے پھوٹے کنگروں پر چڑھ کر رائفل چلانا، جنگل میں گھوم کر شکار کرنا بس یہی اس کے مشغلے تھے۔ کبھی کبھی اس کا باپ سوچتا کہ اس نے اس لڑکی کو لڑکے کی طرح پال پوس کر غلطی کی ہے۔ مگر اب کچھ نہیں ہو سکتا تھا۔

موتیا ہرنی زخموں سے چور ہوتی ہوئی بیگم کی نگاہوں میں تھی، مگر جب وہ قلانچیں بھرتی ہوئی بیگم کی نگاہوں میں تھی کھیتوں پر سے گزرتی ہوئی اس کی نگاہوں میں تھی، مگر جب وہ قلانچیں بھرتی ہوئی تو بیگم کی نظروں سے اوجھل ہو چکی تھی۔

بہار کے پہلے دن تھے۔ جنگل نے نیا نیا چولا بدلا تھا چاروں طرف ہریالی کے باوجود کہیں کہیں ٹیلوں کی اوٹ میں یا پتھروں بھرے نالوں میں برف ابھی تک باقی تھی۔ بلدیالوں کے سیب تو کھٹے نکلے، مگر جانے کس طرح لفٹننٹ نے

ان سیبوں میں تھوڑی سی مٹھاس بھری ہوئی تھی بیگم دن میں گھنٹے گھومنے کے لیے امید کا دامن ہاتھ سے چھوٹ نہ گیا۔ ہرنی اب اسے شاید نہیں ملے گی۔ یہ سوچ کر اس نے ایک جھرنے پر رک کر پانی پیا، منہ دھویا، کمر سے دوپٹہ کھول کر اپنا چہرہ صاف کیا۔ جھرنے کے کنارے کنارے رس بھری کی جھاڑیوں سے اودی، سنہری، شنگرفی رس بھریاں توڑ کر کھائیں، بھوک تھوڑی سی چمکنے لگی تھی، اگر موتیا یوں نہ بھاگتی تو جنگل میں آنے سے پہلے وہ ضرور کھانے کے لیے ایک پوٹلی باندھ کر لاتی۔

نچلی ڈھلانوں اور گھاٹیوں پر انجولا کے نیلے نیلے پھولوں کے تختے کھلے ہوئے تھے، دو خرگوش ایک ساتھ بھاگتے ہوئے نظر آئے۔ ایک بھالو شہد کی مکھیوں کا چھتہ توڑ رہا تھا، ایک بارہ سنگھا اچھل کر فضا میں تیر کی طرح لپکا۔ دو جنگلی کبوتر چیڑ کے پیڑ کی ایک ڈال پر محوِ راز و نیاز تھے۔ بیگم یہ سب کچھ دیکھتے ہوئے اوپر کی گھاٹیوں کی طرف جانے لگی گردن اٹھا کر اس نے اوپر آسمان کی جانب دیکھا اِکا دکا سفید بادل نیلے آسمان میں کہیں کہیں نمودار ہونے لگے، اور ہوائیں ہوتے ہوتے خنکی بڑھتے گی۔

یکا یک بیگم نے موتیا کو نیلا دھاری کی چند جھاڑیوں کے پیچھے کودتے ہوئے دیکھا وہ زور سے چلائی "موتیا"! موتیا! اِدھر آ۔ کم بختی! ۔ تجھے ماروں گی نہیں۔ ماروں گی نہیں، اپنی گود میں اٹھا کر گھر لے جاؤں گی"۔

مگر غلامی کسے پسند ہے؟ موتیا بھی تو جنگل کی اولاد تھی، شاید موتیا بھی جوان ہو رہی تھی، کیسے کیسے بلاوے راتوں کو جنگل کی طرف سے آتے ہیں، کیسی کیسی خوشبو

سے انجان جذبوں کی، حرارت اس احساس کی جب کوئی اکیلا بارہ سنگھا چیل کے کسی درخت کی چھال سے اپنا جسم سہلاتا ہوا کسی ہرنی کی آرزو میں یوں مہکتا ہے کہ دور میلوں نیچے خوبانی کے درخت سے بندھی ہوئی موتیا بیگم کے گھر کے آنگن میں بے قرار ہوجاتی ہوگی۔ قلعے کے چاروں طرف پتھریلی دیواریں تھیں۔ ایک دن گرفت ڈھیلی رہ گئی اور ہرنی رسی تڑا کر بھاگ گئی۔

دائیں بائیں، اوپر نیچے، دوڑتی، گرتی، پھسلتی آوازیں دیتی بیگم قلانچیں بھرتی ہوئی موتیا کے پیچھے پیچھے بھاگی۔ مگر موتیا اسے جل دے کر پھر غائب ہوگئی ایک چھلاوے کی طرح۔ ایک اونچی چٹان پر وہ اسے ایک پل کے لیے نظر آئی پھر موتیا تے ہوا میں قلانچ بھری اور اوپر دیودار کی گھاٹی میں غائب ہوگئی۔

بیگم اپنی ہرنی کی تلاش، تعاقب اور دوڑ دھوپ میں اس قدر منہمک رہی کہ اسے آسمان پر بادلوں کے چھا جانے اور خنکی کے بڑھنے کا ذرا بھی احساس نہ ہوا۔ اسے احساس ہوا تو اس وقت جب ایک دم چاروں طرف دھند چھا گیا، اور کوئی اعلان کیے بغیر روئی کے گالوں کی طرح برف گرنے لگی۔ ارے!۔ اس نے یہ سوچا ہی نہ تھا بہار کے پہلے دنوں میں برف گرتی تو ہے مگر بہت کم۔ اب یہ حادثہ اس کے سامنے ہوا تھا اور وہ اپنے گھر سے بہت دور تھی۔

موتیا کی کھوج میں ڈھونڈتے ڈھونڈتے وہ بہت اوپر کوہستانی سلسلے میں نکل آئی تھی۔ برف کے گرنے سے چاروں طرف کا منظر سپیدی میں بدل رہا تھا۔ بیگم کو کچھ نہیں سوجھ رہا تھا کہ کیا کرے۔ پھر اسے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ راستہ بھٹک گئی ہے، جیسے درخت چھدرے ہونے لگے ہیں اور وہ سرے پاؤں تک

بھیگ چکی ہے۔ اوپر آکر ہوا بھی تیز ہو گئی تھی، پھر اس نے اوپر آکر جھکا مری کی ڈھوک کو محسوس کیا۔ مگر دیکھا نہیں۔ اور محسوس اس لیے کیا کہ اب اس کے قدموں تلے چاروں طرف ہری گھاس بچھی ہوئی تھی، جس پر برف کے گالے گر گر کر برف کی تہیں جمارہے تھے کچھ دیر کے بعد ساری گھاس برف سے اٹ جائے گی، اور برف، برف پر گر گر کر سفیدی کی تہیں جماتی جائے گی۔

پھر اس نے سوچا یہیں کہیں بکر والوں کا گھر ہوگا۔ ہونا ہی چاہیے۔ اس نے کئی بار دیکھا تھا گرمیوں میں بکر وال یہاں آتے رہتے ہیں۔ یہاں کوئی درخت نہیں ہے۔ بس برف ہے اور چٹانیں، مگر پھر بھی کہیں وہ گھر ہوگا۔ بڑا سا مویشی گھر بکروالوں کے گلے کی حفاظت کے لیے اور خود ان کے رہنے کے لیے اس وقت جب ان اونچائیوں پر اس طرح بے موقع برف باری ہونے لگے۔

پھر آپ ہی آپ جب وہ امید کھو چکی تھی تو اس نے دھند میں ابھرتے ہوئے ایک سیاہ دھبے کی طرح اس گھر کو دیکھا اور وہ خوشی کی ایک ہلکی سی چیخ مار کر اس کی طرف دوڑتی چلی گئی۔

گھر میں کوئی دروازہ نہ تھا۔ بیگم ہدڑتی ہوئی برف سے بچتی ہوئی گھر میں داخل ہو گئی۔

داخل ہوتے ہی وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی۔

دور مویشی خانے کے ایک کونے میں آگ جل رہی۔ کوئی اس کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا تھا۔ اور جو کوئی بھی اس کی طرف پیٹھ کیے بیٹھا تھا۔ اس نے اس کی ملوبیت کا انگشاف کیا تھا، کیونکہ مردہ موتیا اس آدمی کے قریب پڑی تھی۔

یکایک آہٹ پاکر اس آدمی نے گردن موڑ کر دیکھا۔
پھر بیگم کے منہ سے ایک ہلکی سی چیخ نکل گئی۔
یہ شیر علی تھا۔

اگلے چند لمحوں میں بہت کچھ ہوا۔ شیر علی نے لال بھبھوکا ہوتی ہوئی بیگم کو اپنے کندھے سے رائفل اتار رہے اپنے ہاتھ میں سنبھالتے دیکھا۔ بجلی کی سی سرعت سے وہ الاؤ کے پاس سے اٹھا اور ہاتھ کے ایک ہی وار سے اس نے رائفل کا منہ پھیر دیا۔ رائفل گر کر الگ جا پڑی۔ بھوکی شیرنی کی طرح بیگم اس پر پل پڑی دیر تک دونوں ایک دوسرے سے گتھم گتھا ہوتے رہے۔ بیگم نے کسی وحشی جانور کی طرح اس کے گلے پر تاٹ کھایا۔ شیر علی نے اس کے دو گھونسے رسید کیے اور وہ گر پڑی۔ شیر علی اسے چھوڑ کر اپنے رخسار سے بہتے ہوئے خون کو صاف کرنے لگا، اور اسے گالیاں دینے لگا۔ اسے ننگی بے تکی جواب بھی ملتا گیا۔

"کتیا۔"

"حرامی۔"

"سور کی اولاد۔"

"بھالو کا بچہ۔"

"طوفان کا ایک تھپیڑا دروازے کے چپٹے کی طرح اندر آیا اور جلتے ہوئے الاؤ کو آدھا بجھا گیا۔ شیر علی بیگم کو چھوڑ کر اپنے الاؤ کو جلانے کے لیے دروازے اور بیگم کی طرف پیٹھ کر کے بیٹھ گیا۔ اور بیٹھے بیٹھے انتہائی بیزاری سے بولا "سارا

رات اسی مویشی خانے میں کاٹنی ہے ۔ اگر الاؤ بجھ گیا تو صبح تک ہم دونوں کی قلفی جم جائے گی ۔ اچھی طرح سوچ لو ۔"

بیگم زیرِ لب اسے گالی دیتے ہوئے اپنی رائفل اٹھا کر الاؤ سے دور ایک کونے میں لگ کر بیٹھ گئی ۔ وہ ساری رات اسی طرح رائفل ہاتھ میں لیے بیٹھی رہے گی ، مگر اس کے جہنمی الاؤ تک نہیں جائے گی ۔

الاؤ کے شعلے دیواروں پر ناچتے رہے ۔ طوفان تیز ہو گیا ۔ مری ہوئی مُنّا کو دیکھ کر بیگم کی آنکھوں میں آنسو آ گئے ۔ وہ چپکے چپکے رونے لگی ۔

اس کی سسکیوں سے بے نیاز شبیر علی جانوروں کے دو چار کھونٹے اور اکھاڑ لایا اور انہیں الاؤ میں جھونک دیا ۔ شعلے بلند ہونے لگے ۔ ٹھنڈی یخ بستہ دیوار سے لگی بیگم اپنی جگہ سے کھسکی اور دھیرے دھیرے شعلوں کی طرف چلی جیسے لوہا مقناطیس کی طرف کھنچتا ہے ۔ امان ادھر ہی تھی جدھر الاؤ جل رہا تھا ۔

بیگم نے آگ تاپنے کے لیے ہاتھ بڑھائے ۔ سامنے الاؤ کی دوسری طرف شبیر علی بیٹھا تھا ، مگر بیگم اس کی طرف دیکھ نہیں رہی تھی ۔ دھیرے دھیرے اس کے گیلے کپڑے سوکھنے لگے ۔ دھیرے دھیرے بدن میں گرمی سرایت کرنے لگی ۔ وہ دن بھر کی تھکی ہوئی تھی ۔ آپ ہی آپ تھکن اور نیند سے اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں ۔ پاؤں پسار کر وہ وہیں الاؤ کے قریب سو گئی ۔

جب بیگم کی آنکھ کھلی تو مویشی خانے میں گھپ اندھیرا تھا ۔ الاؤ بجھ چکا تھا ۔ باہر طوفان زوروں پر تھا ۔ بیگم کا سارا بدن سردی سے کانپ رہا تھا کیونکہ

ہوا کا تھپیڑ کبھی پردے کہیں دور نیچے چلا گیا تھا، دروازے سے نوکیلی ہواؤں کے فراٹے کھلی چوکھٹ سے اندر آتے اور اس کے بدن کو پہلے سے زیادہ برفیلا بنا جاتے۔ اتنے میں کہیں بجلی چمکی اور اس کی روشنی جو اندر آئی تو بیگم نے دیکھا کہ شیر علی الاؤ کے دوسرے کنارے اپنا ہنٹنگ کوٹ اپنے سر اور پیٹھ پر ڈالے مزے سے سو رہا ہے۔ بجلی کی چمک گئی تو پھر اندھیرا چھا گیا۔ مگر بیگم کے ذہن کی روشنی میں کوٹ بار بار چمکنے لگا۔ بیگم نے بہت دیر تک اس کوٹ کے قریب جانے کی خواہش کے خلاف مزاحمت کی، مگر جب سردی بے تحاشہ بڑھ گئی، اور اس کا سارا جسم سن ہونے لگا اور سارے جسم میں ہزاروں سوئیاں سی چبھنے لگیں تو وہ دھیرے دھیرے اس کوٹ کی طرف بڑھ گئی۔ پھر اس نے شیر علی کے جسم سے لگ کر اپنے آپ کو اس کوٹ میں چھپا لیا۔

پہلے تو شیر علی چپ چاپ اس کی طرف پیٹھ کیے لیٹا رہا، پھر کروٹ لے کر اس نے بیگم کو اپنے دونوں بازوؤں میں سمیٹ لیا۔ کچھ دیر تک تو وہ اس کی بانہوں میں سمٹی رہی، سسکتی، کانپتی، تھرتھراتی رہی، پھر دھیرے دھیرے شیر علی کے بازوؤں اور اس کے بدن کی بڑھتی ہوئی حدت اور اس کے جوان جذبے کی شدت سے موم کی طرح پگھلنے لگی۔ کچھ وقت اور گذرا تو اس نے محسوس کیا کہ جہاں پہلے دو جسم تھے وہاں اب بس ایک ہی ہے۔ اور اب ایک بھی نہیں۔ بس نور اور حرارت کا ایک گولہ ہے جو اپنے مدار پر خود بخود گھوم رہا ہے.....

یکایک بیگم ہڑبڑا کر جاگی، رات غائب ہو چکی تھی اور اس کے ساتھ طوفان بھی، دن اتنا نکل آیا تھا کہ دھوپ کا ایک بڑا سا مستطیل اس کے پاؤں اور

آدھے بدن تک آ پہنچا تھا گھبرا کر وہ اٹھ بیٹھی اور شیر علی کی بانہوں کا حصار توڑ کر دوڑتی ہوئی مویشی خانے سے باہر نکل آئی، اور دیر تک باہر کی دیوار کے قریب کھڑی کھڑی دھوپ سینکتی رہی۔

دھیرے دھیرے جیسے اس کے بدن میں اور لہو میں دھوپ سرائیت کرتی گئی اور اس کے ساتھ اس کے دل میں غم و غصہ، غیض و غضب اور نفرت کا طوفان ابھرنے لگا۔ یہ کیا کیا اس نے، کیا ہو گیا تھا اسے؟ صدیوں کی مضبوط روایت کو توڑنے والی وہ کون ہے؟ اور پھر کس کے لیے؟ اس گھٹے ماتھے، نوکیلی ظالم مونچھوں والے، بانہوں، سینے اور سارے بدن پر بال رکھنے والے بھالو کے بچے کے ساتھ؟ چھی چھی چھی! اسے اپنے آپ سے گھن آنے لگی۔

ابھی وہ اتنا ہی سوچ پائی تھی کہ اندر سے شیر علی بھی باہر نکل آیا اور دروازے کے دوسری طرف والی دیوار سے لگ کر دھوپ سینکنے لگا۔

وہ بیگم کی طرف دیکھ مسکرایا۔ بولا "بیگماں، اب تو شادی کر لو مجھ سے"۔

بیگم نے انتہائی نفرت سے اس کی طرف دیکھا اور دیکھ کر تھوک دیا۔

"یہ کیا خنزیر کی اولاد!" شیر علی غصے سے چلّایا۔

"چپ رہ کتیا کے بچے!" بیگم بپھر کر بولی "تو نے میری ہرنی کی جان لی ہے، میں تیرے سات کتوں کو گولی کا نشانہ بنا کر رہوں گی۔"

"میں تیرے اصطبل کے سارے گھوڑوں کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔" شیر علی کا غصہ بڑھنے لگا۔ اس کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔

"تو کسی ایک کو ہاتھ لگا کر تو دیکھ۔" بیگم غضب آلود لہجے میں بولی "میں

تیری اور تیرے سارے خاندان کی جان لے لوں گی۔"

"لعنت ہو تجھ پر اور تیری سات پشتوں پر۔"

اتنا کہہ کر شیر علی نے مردہ ہرنی کو اٹھا کر اپنے چوڑے کندھے پر ڈال لیا، اور لپکتا جھکتا مغربی ڈھلان کی جانب مڑنے لگا۔

بیگم نے اپنی رائفل اٹھالی اور اسے اپنے کاندھے پر لٹکا لیا۔ برف کا ایک بڑا سا گولہ بنا کر اسے زور سے شیر علی کی طرف پھینکا اور پھر مخالف سمت میں بڑی تیزی سے مشرقی ڈھلان پر اترتی چلی گئی۔

گیت اور پتھر

نفرت بھی ایک طرح کی محبت ہے، اعجاز حسین زیدی کی مثال آپ کے سامنے ہے، زیدی کو عورتوں سے نفرت ہے زیدی بدصورت ہے، اور اسے اپنی بدصورتی کا شدید ترین احساس ہے، زیدی ٹھگنا بلکہ بونا ہے، اور اسے اپنے کوتاہ قد ہونے پر فخر نہیں۔ زیدی کی چال میں ایک ایسی عجیب سی ناہمواری ہے کہ جسے دیکھ کر بے اختیار ہنسی آجاتی ہے، اور ... لوگ اِس کا دل رکھنے کے لیے اس پر ہنستے نہیں ہیں، اس کی عزت کرتے ہیں، اس کی آؤ بھگت اچھے ڈھنگ سے کرتے ہیں، خاص طور پر اسے اپنے پاس بٹھانے کی کوشش کرتے ہیں۔ تو وہ اور بھی خفا بلکہ برافروختہ ہوجاتا ہے، شاید وہ دل سے چاہتا ہے کہ لوگ اسے بدصورت، ٹھنگنا، بونا کہیں، اسے گالی دیں، اس سے دور دور رہیں، میں نے اکثر دیکھا ہے کہ جو لوگ اسے پھٹکارتے ہیں وہ اُن سے خوش رہتا ہے، اور جو لوگ اس کی دلجمعی کی کوشش کرتے ہیں وہ انہیں اچھا نہیں سمجھتا، بلکہ اس کی دلجمعی کی جتنی کوشش کی جائے وہ اتنا ہی کبیدہ خاطر ہوتا جاتا ہے،

میرے مشاہدے میں زیدی پہلا آدمی ہے جو اس حد تک اذیت

پسند ہے کہ ہر وقت اپنے آپ کو ذہنی طور پر کوڑے مارتا رہتا ہے۔ نذیدی بیسویں صدی کا باشندہ ہے اس لیے ایک فلم کمپنی میں اسسٹنٹ ڈائریکٹر ہے اگر وہ سولھویں صدی میں ہوتا تو کیتھولک راہب ہوتا، سخت گیر مُلّا ہوتا، اسفل ترین محتسب ہوتا، لیکن بیسویں صدی نے اسے فلم ڈائریکٹر کا اسسٹنٹ بنا دیا ہے۔ اسے اس بات میں بھی مزا آتا ہے کہ اس کی تقدیر اس قدر بری ہے۔ لوگ خوبصورت اشیاء، اچھی باتوں اور جمالی اوصاف سے حظ اٹھاتے ہیں، نذیدی کو دکھ، درد، گناہ، بدصورتی اور اس گہرائی میں دلچسپی ہے جو نیچے جاتی ہے، جو چیز اوپر اٹھتی ہے جیسے آسمان، درخت کی چوٹی، کبوتر کی اڑان، ان باتوں میں اس کی دلچسپی قائم نہیں رہتی، وہ شر، بدی اور نفرت کا قائل ہے۔ اس میں اور فرشتوں میں صرف ایک قدم کا فاصلہ ہے۔

نذیدی کو عورتوں سے سخت نفرت ہے، وہ ان کے سائے تک سے نفرت کرتا ہے۔ وہ انہیں ادنیٰ ترین مخلوق کہتا ہے، شوپن ہار کا پرستار ہے۔ سٹوڈیو میں جہاں عورتیں کھڑی ہوں گی وہاں لوگوں کے ٹھٹ کے ٹھٹ نظر آئیں گے، لیکن نذیدی کبھی وہاں نہ ہوگا۔ اگر کبھی اسے لڑکیوں کے پاس سے گزرنا پڑے تو وہ اس قدر اکڑ کر اور اس قدر تن کر چلتا ہے کہ اس کی حالت مضحکہ خیز ہو جاتی ہے جیسے اس کے جسم کا ذرہ ذرہ عورت عورت پکار رہا ہو۔ بھوک جب اس منزل پر پہنچ جائے تو نفرت بن جاتی ہے۔ بھوک دراصل زندگی، حرکت، عمل کی علامت ہے، لیکن بھوک کی آخری منزل موت، جمود اور سکوت بھی ہے۔ نذیدی کی جنسی حسیات اس قدر نازک ہو چکی ہیں کہ شاید

اسے مرد کہنا بھی ایک مبالغہ آمیز حقیقت ہوگا۔ زیدی کی مردانگی نے اپنی بدصورتی سے مار کھائی، اور یہ بدصورتی عورت کی نسائی جمالیت سے ٹکرا کر نفرت میں مبدل ہو گئی۔ اب وہ نہ مرد ہے نہ عورت، سرتاپا نفرت ہے۔ وہ اک ایسی پریشان روح ہے جس نے اپنے آپ اُلجھا اُلجھا کر گرہیں لگا لی ہوں۔ اور اب ان گرہوں کا کھلنا اس کے لیے نہایت مشکل ہو، شاید اب وہ خطِ مستقیم کی تاب نہ لا سکے گا۔ زیدی کی یہ حالت ہمارے ملک کے سیاسی رہنماؤں سے بہت ملتی جلتی ہے۔

زیدی سے اگر یہ کہا جائے کہ فلاں عورت کو سیٹ پر حاضر ہونا چاہیے۔ تو اوّل تو زیدی سنی اَن سنی کر دے گا، دہرانے پر اس طرح گھورے گا گویا آپ نے یہ کہہ کر کسی فعل شنیع کا ارتکاب کیا ہے۔ اگر آپ زیادہ ڈھیٹ نکلے تو وہ سیٹ چھوڑ کر باہر چلا جائے گا، اور پھر وہاں سے وہ مطلوبہ عورت کو بلانے کے لیے کسی چپراسی کو بھیجے گا، یا کوئی دوسرا پیاسی ڈھونڈے گا، چاروناچار اگر اسے خود جانا پڑے تو لڑکی کے سامنے کھڑا ہو کر اس سے بات کرے گا: "سیٹ پر آیئے"۔ اور اس کے بعد بکلخت وہاں سے چل دے گا۔ اس کی حرکات میں اس وقت روانی نہیں ہوتی۔ عموماً زندگی میں اک ترتیب ہوتی ہے، ہر حرکت میں اک تواتر کا احساس ہوتا ہے۔ زیدی کو دیکھ کر اس وقت یہ احساس ہوتا ہے کہ یہ انسان نہیں ہے، اک بے روح پیکر ہے جو اٹھا کر لڑکی کے سامنے لایا جا رہا ہے۔ اس کی چال ڈھال، گفتار، اطوار میں اک عجیب بے ہنگم میکانکی حرکت کا احساس ہوتا ہے۔ آٹومشین کے سے تال انسان کبھی شاید اس

سے بہتر ہوتے ہوں گے بالعموم عورتوں کا اثر مردوں پر بہت ہوتا ہے، شدید ہوتا ہے، اور جب تک اعصاب تولید تخلیق قائم رہتے ہیں اثر ہوتا ہی رہتا ہے۔ لیکن جتنا اثر اس مخلوق کا میں نے زبیدی پر دیکھا ہے اور کسی فرد پر نہیں دیکھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ زبیدی کے جسم اللہ رکھ کا ہر ذرّہ ایک آنکھ ہے، اور عورت کے وجود کو دیکھتے ہی اس سے منکر ہونے کے لیے بیتاب ہے۔ لوگ دو آنکھوں سے عورت کو دیکھتے ہیں اور مر جاتے ہیں۔ زبیدی کروڑوں آنکھوں سے دیکھتا ہے۔ اس کے دل کی کیا حالت ہو گی۔ میں سمجھتا ہوں کہ یہاں پہنچ کر محبت نفرت میں اور زندگی موت میں تبدیل ہو جاتی ہے۔

جب ہمارے سٹوڈیو میں رمبھا پہلی بار آئی تو پروڈیوسر سے لیکر سیٹنگ بوائے تک مسرت سے چہکنے لگے۔ دراصل خوبصورت عورت خوشی کا ایک لمحہ ہے، جو جنت کی وادیوں سے اس سرزمین تک آتا ہے۔ پھر اس لمحے کو پانے، چکھنے، حاصل کرنے، اس کے لیے مر جانے کے لیے بیقراری کیوں نہ ہو اور رمبھا تو ایسی عورت تھی جیسے لہر، لچکتی ڈالی، چمکتی بجلی، جیسے فضا میں تبسم کی کمان کھنچ جائے اور گم ہو جائے۔ اور گم ہونے کے بعد بھی تخیل میں اس کے رنگ چھلکتے رہیں۔ یہی حال رمبھا کا تھا۔ عورتیں جوان بھی ہوتی ہیں، خوبصورت بھی ہوتی ہیں، شعریت، رس اور غنائیت سے لبریز بھی ہوتی ہیں۔ لیکن رمبھا کے حسن کی لَے دوسری عورتوں سے بالکل الگ تھی۔ اس کے حسن کا احساس اس کے سامنے نہیں اس کے سامنے سے گذر کر جانے کے بعد ہوتا تھا جیسے کوئی چیز چمک گئی۔ وہ سامنے سے گذر جاتی اور بعد میں یہ خیال

آ آ۔ خیال نہیں آتا۔ تصویریں سی آتیں۔ پھولوں کے گجرے، قوسِ قزح کے رنگ، بچوں کا تبسم، آسمان کی دھنک، رات میں کہکشاں کے دودھیا شرارے، موتیوں کی لڑی یا ایک بکھرتی ہوئی ان سب تصویروں کا خیال اسے دیکھ کر آتا تھا۔ اس کا حسن فانی تھا، لیکن اس حسن کی گونج دیرپا تھی۔ جو تصویریں اس حسن کو دیکھنے سے اجاگر ہوتی تھیں، وہ لافانی تھیں۔ خوبصورتی کی اس سے بہتر تعریف نہیں ہو سکتی۔ رمبھا کو دیکھ کر یہ خیال نہ آتا تھا کہ یہ عورت خلم ایکڑیس ہے، بیوی ہے بچوں کی ماں ہے۔ غم روزگار اور ذوقِ خودنمائی سے آگاہ ہو چکی ہے۔ وہ جو سراپا تھی، فضا میں ایک شعلہ سا اُٹھتا تھا۔ کئی پروانے خاکستر ہو گئے!

غیر ممکن تھا کہ ایسے وجود سے زیدی کو نفرت نہ تھی۔ نحت الثریٰ کا بسنے والا بلندی سے نفرت کیوں نہ کرتا۔ اگر محبت نفرت ہے۔ تو گہرائی بھی ایک طرح کی الٹی بلندی ہے۔ اس کے تخیل میں وہ افق نہ تھے جن پر بجلی کا کوندا لہراتا ہے۔ وہ اس تاریک افق تک نیچے پہنچ گیا تھا۔ جہاں کیچڑ کا لجلجا مادہ اکٹھا ہو جاتا ہے۔ اور خیال میں کیڑے رینگنے لگتے ہیں۔ جیسے مثبت اور منفی ایک دوسرے سے الگ رہتے ہیں۔ اسی طرح سیٹ پر رمبھا اور زیدی ایک دوسرے سے الگ اور دور رہتے تھے۔

انسانی فطرت پانی کی طرح اپنی سطح ہموار رکھتی ہے۔ رمبھا نفرت نہ کر سکتی تھی۔ وہ تو افق پر چاند کی کرن تھی۔ گہرائی کی کیچڑ نہ تھی۔ وہ پر پھیلائے ڈولتے ڈولتے نیچے اتری۔ مسکرائی لجائی موم ہو گئی۔ وہ زیدی کے لیے اس

قدر نرم بن گئی کہ زیدی اسے نگل بھی نہ سکا۔ خود اُگل بھی نہ سکا۔ رمبھا زیدی سے ہنس کر بات کرتی تو زیدی درشتی سے جواب دیتا۔ رمبھا اُسے چائے منگوانے کو کہتی تو وہ جان بوجھ کر چائے نہ منگاتا۔ رمبھا کہتی "زیدی صاحب! آپ کے کپڑے میلے ہیں۔" زیدی دوسرے دن زیادہ میلے کپڑوں میں آتا۔ رمبھا کہتی "داڑھی بڑھائی ہوئی ہے۔ روز شیو کیا کیجیے زیدی صاحب!" زیدی نے سچ مچ داڑھی بڑھالی۔ مولانا ابوالکلام آزاد کی سی داڑھی۔ چیدری چیدری لمبوتری داڑھی جو زیدی کے چہرے کو ایک عجیب وجاہت بخشتی تھی۔ رمبھا کہتی "زیدی صاحب فلاں پکچر بہت اچھی ہے۔ آپ دیکھ آئیں۔" زیدی جواب دیئے بغیر کسی دوسری پکچر میں چلا جاتا۔ درحالیکہ ایک گھنٹہ پہلے وہ خود اسی پکچر کو دیکھنے کا خواہشمند ہوتا اور اپنے دوستوں کے ساتھ وہیں جا رہا ہوتا تھا۔ اس کا جسم اور اس کی روح اپنی پوری قوت اور شدت سے رمبھا کے خلاف مدافعت کر رہے تھے، اس نے شاید سوچ رکھا تھا میری بدصورتی روتی جائیں گی۔ لیکن ہار نہیں مانتے گی۔ اس کی آنکھوں کی مجنونانہ چمک کہے دیتی تھی۔ کہ مقابلہ بہت سخت ہے۔

رمبھا نے اپنا رنگ نہیں بدلا۔ یہ تو کہنا ٹھیک نہیں کہ اسے زیدی سے کوئی لگاؤ تھا، ہاں اتنی دلچسپی ضرور تھی۔ کہ وہ اس کے عورت سے نفرت کے جذبے کو ضرور فتح کرنا چاہتی تھی۔ اور وہ اس کے لیے برابر کوشاں رہی۔ لیکن چونکہ خود بے حد حسین تھی، اور حسن میں خود ایک ایسی تمکنت ہوتی ہے جو آتی کاوش کی تاب نہیں لا سکتی میرا مطلب یہ ہے کہ حسن خود جھکتا ہے حسن اس قدر آبدار

ہے کہ اسے چمکنا ہی چاہیے اس کی نفرت سے روشنی پھوٹ پھوٹ کر نکلتی ہے، زبیدی ایک کاوش سے کم نہیں جیسے جلی ہوئی لکڑیاں جن میں پھونک پھونک کر آگ روشن کی جائے۔ ربیعا ہر وقت چمکتی تھی، کاوش سے کم کام لیتی تھی، کہ خود آگ تھی، سمجھتی تھی کہ ایک دن جلا بیٹھوں گی۔ اس لیے مسکراتی تھی، قہقہے لگاتی تھی، نرم رو ہو جاتی تھی، جیسے روئی کا گالا۔ وہ آہستہ آہستہ زبیدی کے دل پر پھرتی تھی جیسے مرغی انڈے پر۔ اس کے حسن کے نرم نرم پر زبیدی کے دماغ کی پتھریلی سطح کو چھوتے رہتے تھے، اور یہ بالکل انجان پنے میں گویا ہوتا تھا۔ اس قدر بھولے پن اور معصومیت سے زبیدی کی نفرت اور بھی بڑھ گئی۔

اب تک زبیدی کی نفرت کی منزل یہ تھی، کم نگاہی، خود آگاہی اور لاپرواہی اب نفرت اتنی بڑھ گئی کہ اس نے کبھی کبھار ربیعا سے بات کرنا شروع کر دیا۔ "یہاں مت بیٹھئے!" "یہ کرسی اچھی ہے۔" "وہ آدمی بُرا ہے۔" "یہ پیالہ ٹوٹا ہوا ہے۔" "یہ فقرہ غلط ہے۔" "یہ زاویہ درست ہے۔" چھوٹے چھوٹے معنی سے فقرے سخت، کرخت، پتے تلے میکانکی انداز میں ایک جھٹکے سے بل کھلتے ہوئے، جیسے گلاب کی کلی کی طرف رجوع کر رہا تھا۔

پھر یہ نفرت اور بڑھی جب ربیعا نے شانت سے محبت کرنی شروع کی۔ شانت ہیرو تھا، ربیعا ہیروئن۔ محبت اتنی ہی لازمی ہے جیسے دو وقت کا کھانا یا ساڑھی کے ساتھ بلاؤز پہننا۔ زبیدی اس محبت کو قریب تر لا رہا تھا۔ وہ دونوں کو اکٹھے ہونے کا موقع دیتا۔ شاٹ سے پہلے دونوں کو الگ لے جا کر ریہرسل کے بہلاتے الگ چھوڑ دیتا۔ چائے کی پیالیوں میں شراب لا

کے دیتا، کہ سیٹ پر شراب پینا منع ہے لیکن چائے پینا منع نہیں ہے اس لیے بے دودھ کی کہہ کر شراب منگائی جاتی۔ اور زیدی یہ بے دودھ کی چائے خود لاتا تھا، اور رمبھا اور شانت کی عامیانہ حرکتوں سے اپنے جذبۂ نفرت کو تقویت پہنچاتا رہتا تھا، غالباً اس پر یہ احساس غالب تھا کہ عورتیں کتنی جاہل ہوتی ہیں کیسے دیکھ جاتی ہیں، کس طرح شانت ایسے چند سے پیار کر سکتی ہیں، کتنی جلد بیوفائی کا جامہ پہن لیتی ہیں، یہ عورتیں نفرت کے قابل ہی تو ہیں، جوں جوں زیدی کی نفرت بڑھتی گئی، وہ اور بھی رمبھا کے قریب ہوتا گیا۔ اب اس کی باتوں کی ناہمواری غائب ہو گئی، اب وہ اس کے سامنے ہنس دیتا تھا، قہقہے لگاتا تھا، پنچ اور السٹریٹڈ ویکلی کے لطیفے بیان کرتا تھا اسے پڑھنے کے لیے کتابیں دیتا تھا، رمبھا اس کے لیے سویٹر بن رہی تھی، پچھلے دنوں جب اس کا خاوند آیا تو زیدی نے اسے اس طرح باتوں میں الجھائے رکھا کہ شانت اور رمبھا کو اکیلے پکچر جانے کا موقع بھی ہاتھ لگ گیا، یہ عورت! زیدی دل میں ہنستا تھا، بدصورتی نے خوبصورتی پہ فتح پائی رکھی تھی۔

یہ نفرت یونہی چلتی رہی۔ حتیٰ کہ پکچر کا آخری دن آگیا، زیدی سیٹ پر نہیں آیا، پکچر ختم ہو گئی، تالیاں، ہار، پھول، مٹھائی، مسرت و انبساط۔ پرسوں رمبھا واپس چلی جائے گی، اپنے خاوند کے پاس، شانت ہمیشہ درد عاشقوں کی طرح رنجور، داڑھی بڑھائے، بال پریشان کیے، رمبھا کے سامنے آہیں بھرتا تھا اور وہ اپنے حسن کی تاثیر پر مسکراتی تھی، پھر اس نے کسی سے پوچھا "زیدی کہاں ہے؟" یونہی لاپرواہی سے جیسے آدمی کسی بہت ہی عزیز بات کا ذکر کرتے کرتے اپنے کتے کو پچکارنے لگے۔ زیدی کہاں ہے، موتی کہاں ہے، ڈبو کہاں

بے بیچارہ بدصورت، مایوس، مجبور، بیمار کہاں ہے۔ وہ اسے ڈھونڈتی پھری۔ پروجیکشن روم میں، کیمرہ روم میں، ساؤنڈ کے کمرے میں، دفتر میں، خود اس کے کمرے میں۔ وہ کہیں نہیں تھا۔ آخر وہ میوزک روم میں گئی۔

میوزک روم میں اندھیرا تھا۔ تاریک اور بلند و بالا کھڑکی کی جھری میں سے اس نے جھانک کر دیکھا کر زیدی پیانو پر بیٹھا گا رہا ہے۔

اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں۔

اس کے گلے میں سوز، پکار، لے، ترنم کچھ نہیں تھا، مگر وزن مزور تھا بھاری بوجھ جیسے گیت پتھر بن جائے اور چھاتی پر بیٹھ جائے۔ جیسے موت کا اندھیرا روشنی کی کرن کو مغلوب کرے اور کائنات کی طرف بڑھتا جائے جیسے نفرت کی چٹان پگھل پگھل کر محبت کے لاوے میں تبدیل ہو جائے۔

زیدی گاتے گاتے پیانو پر سر رکھ کے رونے لگا۔ بدصورتی کا پھول کھل گیا تھا۔ صبا بھی کھڑکی پر کھڑی کھڑی رونے لگی۔

وہ ایک دن اور ایک رات اس سنگیت گھر میں محبوس رہا۔ دراصل وہ محبوس نہیں تھا۔ اس نے کل کائنات کو باہر دھکیل کر اپنے آپ کو سنگیت گھر میں آزاد کر لیا تھا۔ دنیا اور اس کے دکھ اور اس کے غم اور اس کی سفلہ پروریاں اس سنگیت گھر کے باہر قید کر دی گئی تھیں۔ اور وہ ان سب سے آزاد اپنی روح کا نوحہ سن رہا تھا۔

اے غم دل کیا کروں، اے وحشت دل کیا کروں

رات بھر اور دن بھر وہ یہی دھن گاتا رہا اور اس کی بدصورتی پگھلتی گئی۔

سنگیت گھر کے دروازے بند تھے، اور لوگوں کے کھٹکھٹانے اور شور مچانے اور رسبھا کے چلانے پر بھی نہیں کھلے۔ اور جب رسبھا چلی گئی تو لوگ کھڑکی توڑ کر اندر گھس گئے۔ زیدی پیانو پر اوندھا پڑا تھا، اس نے بلیڈ سے اپنی انگلیاں چھیل لی تھیں، اور پیانو کے سفید سروں میں اپنے خون کا راگ بھرا تھا، اس نے اپنی بدصورتی کے نہاں خانے میں حسن کی محفل سجائی تھی، اور نفرت کی اندھی کوکھ میں محبت کے نرم جذبے کی تخلیق کی تھی، آج وہ ایک عاملہ عورت کی طرح بے ہوش پڑا تھا، اور اس کی آنکھیں اور اس کے گال اور اس کی داڑھی آنسوؤں سے بھیگی ہوئی تھی۔

کئی دنوں کے بعد زیدی کو رسبھا کا ایک خط ملا۔

"پیارے زیدی، تم نرے احمق ہو میں نے تم سے دلچسپی ظاہر کی، تم نے جانے کیا کچھ سمجھا۔ یہ تمہاری غلطی تھی۔ میں ایک بیاہتا عورت ہوں، میرے دو بچے ہیں، اپنے خاوند اور بچوں سے پیار کرتی ہوں۔ یہ احمقانہ خیال میرے دل میں بھی نہیں آ سکتا۔ یہ چاندی کا سگریٹ کیس تمہیں بھیجتی ہوں۔"

زیدی نے خط پھاڑ کر جلا دیا۔ اور چاندی کا سگریٹ کیس اٹھا کر کنوئیں میں پھینک دیا۔ اور پھر ٹہلتے ٹہلتے میوزک روم کی طرف چلا گیا۔

ہماری مطبوعات

کارِ جہاں دراز ہے (حصہ اوّل)	قرۃ العین حیدر
〃 〃 (حصہ دوم)	〃
آگ کا دریا	〃
فصلِ گل آئی یا اجل آئی	〃
پطرس کے مضامین	پطرس بخاری
پطرس کے خطوط	〃
زیرِ آب	صفیہ اختر
حرفِ آشنا	〃
گنجے فرشتے	منٹو
انارکلی	〃
ٹھنڈا گوشت	〃
کرنیں	شفیق الرحمٰن
دو ہاتھ	عصمت چغتائی
رات چور اور چاند	بلونت سنگھ
تعمیرِ حیات	ڈیل کارنیگی
زرد پتے	خلیل جبران

پاگل	خلیل جبران
محبت اور جوانی	〃
ایک گدھے کی سرگزشت	کرشن چندر
پھول کی تنہائی	〃
الٹا درخت	〃
محبت کی رات	〃
مضامین کرشن چندر	〃
لذیذ پکوان	شائستہ کوثر
نقوشِ زنداں	سجاد ظہیر
کلیاتِ جگر	جگر مراد آبادی
آتشِ گل	〃
کلیاتِ شکیل	شکیل بدایونی
کلیاتِ ساحر	ساحر لدھیانوی
تلخیاں	〃
گلِ نغمہ	فراق گورکھپوری

مکتبۂ اُردو ادب لاہور